Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جلد:- ۱۸ • شمارہ:- ۱-۲

(جنوری ——— ۱۹۷۹ ——— اپریل)

نگران و مدیرِ اعلیٰ

محمد یوسف ٹینگ

ایڈیٹر

محمد احمد اندرابی

معاون

محمد اسد اللہ وانی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ناشر:- سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

مطبوعہ:- جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی۔

کتابت:- گلزار احمد، شریف احمد

شرح چندہ:- سالانہ دس ۱۰ روپے

فی کاپی دو ۲ روپے

شیرازہ میں شائع شدہ مضامین میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈمی یا ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

خط و کتابت کا پتہ:-

ایڈیٹر "شیرازہ" اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

لال منڈی سری نگر

سرورق:-

عمل: اعجاز ملک

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

"کیفیتِ انتظامِ ملکِ کشمیرِ جنّت نظیر" کے ایک ورق کا عکس

(بہ شکریہ ب۔ پ۔ شرما)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

فاتح کشمیر شد بعد چندی محمد عظیم خان بارکزئی برادر خود را
در کشمیر گذاشت عظیم خان اول نرخ شالی را از سه روپیه تا شش روپیه
رسانید در وصول معامله بدعتهای تازه برپا کرد بسیاری مردمان را
بتهمت های تبراخوانی شکم چاک میکرد در حکومت او شور قحط چنان
برخاست که هزاران مردم هندو و مسلمین که اینوقت متوطن
هندوستان اند از کشمیر در آنوقت فرار شده رفته اند بعضی مردم
هنود بجبر و اکراه مذهب مسلمانی را قبول کردند چنانچه پندت
شوکهه رام سپرو که یکی از روسای شهر کشمیر بود بتهمت باقی داری
بعد زد و کوفت بسیار مذهب مسلمانی را اختیار نمود و سردار محمد عظیم خان
برای برگشتن از مذهب خود او را خلعت فاخره صاحب کاری پوشانید
و یکی از روسای عملان کشمیر بخوف برگردانیدن از مذهب خود

عکسِ تحریر — جس سے علامہ کا "سپرو" ہونا ظاہر ہوتا ہے۔
(بہ شکریہ ب۔پ۔شرما)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

حرفِ آغاز

زیر نظر شمارہ کافی تاخیر سے آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے۔ تاخیر کی کئی وجوہات ہیں، جن میں سے ایک شیرازہ کے ادارہ میں ایڈیٹر کی تبدیلی بھی ہے۔ بہر حال تاخیر کی وجوہات کچھ بھی رہی ہوں، ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس سلسلے میں آپ سے معذرت چاہیں۔

اس شمارہ سے قبل آپ کے ہاتھوں میں شیرازہ کا خصوصی شمارہ "فوق نمبر" ہونا چاہیئے تھا۔ ہم نے مقدور بھر کوشش تو کی تھی، لیکن ہمیں کامیابی نہیں ہوئی۔ محمدالدین فوقؔ کی شخصیت کشمیر کی تاریخ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ خاص شمارہ ان کی نذر کرنے سے ہمارا مقصد و مدعا یہ تھا کہ انہیں عقیدت کے پھول پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر سے باہر اپنے قارئین کو فوقؔ کی ہمہ گیر شخصیت سے واقف کرائیں۔ فوقؔ نمبر تو اب

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اس شمارے کے بعد ہی آپ کے پاس پہنچ پائے گا۔

اس شمارے میں حسب سابقہ کشمیر کی تاریخ اور ثقافت سے متعلق کئی مضامین شامل کئے گئے ہیں جو ہماری تاریخ اور ثقافت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہمیں اپنے قارئین سے امید ہے کہ وہ ہمیں اپنی قیمتی آرا سے آگاہ کریں گے تاکہ شیرازہ کو نئی منزلوں سے روشناس کرنے کے سلسلے میں ہمیں آپ کا بھرپور تعاون میسر ہو۔ ہم نے ہمیشہ ہی قارئین کی پسند کا خاص خیال رکھا ہے اور شیرازہ کو موجودہ معیار تک پہنچانے کے سلسلے میں ان کی رائے اور مشوروں کی قدر کی ہے۔

ادارہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بلدیو پرشاد شرما

علامہ اقبال کے جدِ اعلیٰ

مشہور شاعر و مفکر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا اپنی قومیت کے متعلق بیان جس میں انہوں نے اپنی قومیت سپرو (کشمیری پنڈت) لکھی ہے۔ آج کل ریسرچ اسکالروں کی دلچسپی کا موجب بنا ہوا ہے۔

گذشتہ دنوں پنجاب گورنمنٹ ریکارڈز کی جن تواریخی دستاویزوں کی نمائش سنٹرل سٹیٹ لائبریری چنڈی گڑھ میں لگائی گئی ان میں سات روپیہ آٹھ آنہ کی مالیت کے ایک اسٹام پیپر علامہ اقبال کی اپنی تحریر بھی تھی جس میں انہوں نے لکھا ہے:۔

"منکہ محمد اقبال بیرسٹرایٹ لاء لاہور ولد شیخ نور محمد مرحوم قوم سپرو (کشمیری پنڈت) سکنہ شہر سیالکوٹ حال بیرسٹر ایٹ لاء، لاہور کا ہوں . . . . . "

اس بیان پر گواہ کے طور پر "محمد حسین سپرنٹنڈنٹ دفتر ڈائرکٹر انفارمیشن بیوریو پنجاب، لاہور" کے دستخط موجود ہیں اور یہ دستاویز لاہور کی ایک عدالت میں رجسٹری شدہ ہے۔

اس سے پہلے ہمیں ڈاکٹر اقبال کے بزرگوں کا ایک قدیم کشمیری پنڈت سپرو خاندان

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سے تعلق رکھنے کا ذکر منشی محمد دین فوق کی تصنیف "مشاہیر کشمیر" میں ملتا تھا۔ فوق صاحب کے مطابق:۔

"شیخ صاحب (ڈاکٹر سر محمد اقبال) کو کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے۔ جس کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے۔ شیخ صاحب کے جدِّ اعلیٰ قریباً سوا دو سو سال ہوئے کہ مسلمان ہو گئے تھے۔ گوت ان کی "سپرو" ہے۔ ان کے بزرگوں کا اسلام پر ایمان لانا ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوا اور وہ حسن عقیدت اس وقت تک اس خاندان میں موجود ہے" [1]

ریاست جموں و کشمیر کے محافظ خانہ واقع منڈی مبارک جموں میں ایک قلمی نسخہ ہے جس سے علامہ اقبال کے آباؤ اجداد کے متعلق مزید واقفیت ملتی ہے۔ اس فارسی تواریخ کے مصنف کا نام پنڈت رام جو دھر ہے [2]۔ اس قلمی نسخہ کا نام "کیفیت انتظام ملک کشمیر جنت نظیر" ہے [3]۔

یہ تواریخ اُن بیش بہا سینکڑوں قلمی نسخوں میں سے ایک ہے جو سرگباشی مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۵ء) نے جمع کئے تھے۔

کشمیر میں افغانوں کی حکومت کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ:۔

"بعضے مردم ہنود بجبر و اکراہ مذہب مسلمانی را قبول کردند چنانچہ پنڈت سوکھ رام سپرو کہ یکی از روسائی شہر کشمیر بود تہمت باقی داری بعد زود و کرفت بسیار مذہب مسلمانی را اختیار نمود" [4]

یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب فتح خان بارک زئی اپنے برادر محمد عظیم کو حکومت کشمیر سونپ کر اپنے وطن واپس چلا گیا تھا۔ اِس مصنف کے مطابق یہ واقع ۱۲۲۸ ہجری کا ہے [5]۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانہ کا دوسرا کشمیری تواریخ دان حسن بھی ۱۲۲۸ھ میں

---

[1] مشاہیر کشمیر۔ مرتبہ محمد دین فوق ۔ صفحہ ۱۷۷

[2] جموں آرکائیوز ۔ فائل ۱۱۹۱ آف سنہ ۱۸۸۰ء

[3][4][5] "کیفیت انتظام ملک کشمیر جنت نظیر" ۔ صفحہ ۸۹

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سردار محمد عظیم خان کے حکومت سنبھالنے کا ذکر کرتا ہے[1]۔ مگر تواریخِ حسن میں کسی سوکھ رام سپرو کا ذکر اس زمانے میں نہیں ملتا۔ حسن کے مطابق عطا محمد خان نے ۱۲۳۱ھ میں پنڈت سہج رام در کو عہدہ دیوانی پر مامور کیا تھا[2]۔ اور سردار محمد عظیم خان نے سہج رام در کو بدستور منصب دیوانی پر قائم رکھا۔

ایک اور تواریخ دان ڈاکٹر آر۔ کے۔ پارمو نے لکھا ہے کہ پٹھان گورنر عبداللہ خان الکوزائی (۱۲۹۹ھ ۱۸۰۰ء) نے پنڈت سہج رام کو ریونیو کلکٹر مقرر کیا تھا۔ ڈاکٹر پارمو کا خیال ہے کہ یہ سہج رام دراصل وہی سہجرام سپرو ہے جو ڈاکٹر اقبال کا دادا تھا۔ ڈاکٹر پارمو نے لکھا ہے۔

"ریاست جموں و کشمیر کے فارسی ریکارڈ میں ایک تحریر موجود ہے جس کے مطابق سہجرام سپرو عظیم خان کی حکومت میں کشمیر کے محکمۂ مال کا افسر اعلیٰ تھا اور اس کے ذمہ مالیہ کی بہت سی رقم بقایا تھی کیونکہ اُس نے وصول کردہ مالیہ کی رقم اپنے کنبہ کے چند افراد کی شادی کے موقعوں پر خرچ کردی تھی۔ جب اس واقعہ کی اطلاع گورنر کو ملی تو اُس نے سہج رام کو بلا بھیجا جس نے نہایت دلیری سے اپنا گنہگار ہونا قبول کر لیا۔ گورنر اُس کی جوانی، خوبصورتی اور بے باکی سے متاثر ہوا اور اُس نے سہج رام کو سزائے موت کا حکم سناتے ہوئے اُسے اجازت دی کہ وہ اس کے بدلے میں قبولِ اسلام بھی منتخب کرسکتا ہے۔ پنڈت مذکور نے اسلام اس شرط پر قبول کیا کہ اسے وادیٔ کشمیر سے باہر چلے جانے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ گورنر نے اُسے سیالکوٹ میں رہائش اختیار کرنے کی اجازت دی[3]"

یہ دستاویز ڈاکٹر پارمو نے ۴۰۔۱۹۳۹ء میں دیکھی تھی۔ جس فائل کا حوالہ ڈاکٹر پارمو

---

[1] تواریخِ حسن۔ جلد دوئم۔ صفحہ:۔ ۷۳۰

[2] تواریخ حسن۔ جلد دوئم۔ صفحہ:۔ ۷۲۹

[3] ہسٹری آف مسلم رول ان کشمیر مصنفہ ڈاکٹر آر۔ کے پارمو۔ صفحہ:۔ ۳۷۱ (فٹ نوٹ)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نے راقم کے زبانی استفسار پر دیا وہ وہی فائل ہے جس میں پنڈت رام جودھر کا قلمی نسخہ "کیفیت انتظام ملک کشمیر جنت نظیر" موجود ہے۔ اِس فائل کو راقم نے ڈاکٹر پارمو اور جناب فدا محمد حسنین ڈائریکٹر آرکایوز کی موجودگی میں دیکھا مگر اِس میں وہ تحریر موجود نہ ملی جس کا حوالہ ڈاکٹر پارمو نے دیا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے اس بات پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے کہ کیا سوکھ رام سپرو اور سہج رام دراصل ایک ہی شخص تھے۔ تواریخ حسن سے ہمیں مزید پتہ چلتا ہے کہ سہج رام پنڈت کو عظیم خان نے اپنے بھائی کا تمام مال واسباب بلکہ اُس کے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے کر با حفاظت کابل پہنچانے پر مامور کیا تھا۔ حسن نے لکھا ہے :-

"تمام مال واسباب و آمدت نقد وجنس کہ تعداد آں از یک کروڑ روپیہ افزوں بود معہ حرمخانہ ہمراہ سہج رام پنڈت درکہ مدار المہام او بود بیشتر روانہ کابل ساخت"[1]

پنڈت جیا لعل کلم نے بھی فوق صاحب کی "تواریخ کشمیر" کے حوالہ سے پنڈت سہج رام درکے "صاحب کار" کے عہدہ پر مامور کئے جانے کا ذکر کیا ہے[2]۔ حسن کی تحریر کے مطابق سہج رام پنڈت در کشمیر کے اُن روساء میں سے ایک تھے جو سردار ہری سنگھ کے عہد گورنری میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حضور میں بھیجے گئے تھے اور جنہوں نے اپنے برادر کی فوتیدگی کے بعد اپنے عہدہ سے استعفےٰ دے دیا تھا[3]۔

مندرجہ بالا واقعات ظاہر کرتے ہیں پنڈت رام جودھر کی تواریخ میں دیا گیا نام سوکھ رام سپرو ہی ڈاکٹر اقبال کا وہ جدِ اعلیٰ تھا جس نے اسلام قبول کیا تھا۔

---

[1] "تاریخ حسن" جلد دوئم۔ صفحات ۷۳۷ و ۷۳۸

[2] "ہسٹری آف کشمیری پنڈتس"۔ مرتبہ جیا لعل کلم۔ صفحہ ۲۰۸

[3] "تاریخ حسن" جلد دوئم۔ صفحہ ۷۵۹

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

عبدالغنی شیخ

کشمیر میں اردو رسائل کا مطالعہ

کسی ملک کے علمی ذوق کا تعین اس ملک کے لوگوں کے ذوقِ مطالعہ (اچھے برے مذاق اور ذہنی سطح کا اندازہ کتابوں کے انتخاب سے کیا جا سکتا ہے۔ مطالعے کے ضمن میں رسائل اور جرائد کا پارٹ نہایت ہی اہم ہے۔ رسالے جہاں ہر ماہ علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی، فلمی اور کھیل کود سے متعلق تازہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں وہاں قارئین کو ادیبوں اور شاعروں کی نئی تخلیقات بھی فراہم کرتے ہیں۔

اردو ریاست کی سرکاری زبان اور تینوں اکائیوں میں یکجہتی اور رابطہ رکھنے کا بہترین وسیلہ ہی نہیں بلکہ یہ وادی کشمیر کی تہذیبی زبان بھی ہے۔ علم کی تشنگی ہو یا سیاست کا چسکا ادب کا ذوق ہو یا کھیلوں کا شوق مذہبوں سے لگاؤ ہو یا جاسوسی یا فلمی کہانیوں کی چاہ، وادی کشمیر میں لوگ اپنی ذہنی بھوک اور علمی ذوق کی تکمیل کے لئے اردو زبان کا سہارا لیتے ہیں۔ جہاں ایک دوشیزہ فلمی رسالوں میں گھنٹوں کھوئی رہتی ہے وہاں ایک نیم خواندہ آدمی ایک اردو اخبار کو آنکھوں سے لگائے اس کی ایک ایک سطر پڑھتا ہے اور اخبار کی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھتا ہے۔

میں نے وادی میں اردو رسائل کے مطالعے سے متعلق کچھ مدت پہلے سرسری سروے کیا تھا۔ یہ رسائل سری نگر کی دو بڑی نیوز ایجنسیاں منگاتی ہیں۔ اس کے علاوہ شہر اور قصبہ جات میں کئی اور ایجنسیاں نکلی ہیں۔ میرے اعداد و شمار کے مطابق وادی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

میں تقریباً چالیس مختلف اردو رسالے آتے ہیں۔ اور ان کی مجموعی تعدادِ فروخت تقریباً سات ہزار کے قریب ہے۔ لگ بھگ اتنی ہی تعداد میں ریاست سے باہر چھپنے والے اخبارات کی کاپیاں یہاں بکتی ہیں۔ ان میں "نئی دنیا" سرِ فہرست ہے اور اس کے بعد "عوام" بکتا ہے۔ ان دو ہفت روزوں کے علاوہ "اردو بلٹز"، "قشمین" اور "ہند سماچار" کی کاپیاں سینکڑوں کی تعداد میں بکتی ہیں۔

یہاں کی مادری زبان کشمیری موثر کردار ادا کر سکتی تھی لیکن ابھی تک یہ مطالعہ کا یہ عالم ہے ایک اخبار بھی نہیں چلتا ہے جبکہ یہاں سے اردو میں کئی کثیر الاشاعت روزنامہ اخبار نکلتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر کی چھبیس لاکھ آبادی میں خواندگی کی شرح ۸ر فی صد ہے۔ اس تناسب سے وادی میں پانچ لاکھ افراد خواندہ ہیں۔ مسلمانوں کی شرح خواندگی سات فیصد ہے۔ اس حساب سے وادی میں تقریباً چار لاکھ مسلمان خواندہ ہیں۔ محتاط اندازے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وادی میں اردو خوان یا اردو دان افراد کی تعداد چار لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چار لاکھ اردو دانوں میں ہر سو خواندہ آدمیوں میں اوسطاً دو آدمی ہر ماہ ایک رسالہ خریدتے ہیں اور دو ڈھائی روپے ماہوار خرچ کرتے ہیں ـــــ یہ اعداد و شمار ہمارے ذوقِ مطالعہ کی شرح پر ایک المناک کومینٹری ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ہر ایک ہزار افراد میں سے سات سو سے آٹھ سو افراد اخبارات اور رسالے خریدتے ہیں۔ وادی کے درجن بھر سینما ہالوں میں روزانہ بیس پچیس ہزار آدمیوں سے کیا کم لوگ فلمیں دیکھتے ہوں گے اس حساب سے ایک مہینے میں آٹھ لاکھ آدمی اور ایک سال میں تقریباً کروڑ آدمی فلمیں دیکھتے ہیں۔ ایسے میں فلموں پر خرچ کی جانے والی رقم سالانہ کروڑوں روپے تک پہنچتی ہے۔

رسالوں میں سب سے زیادہ ماہنامہ "شمع" آتا ہے۔ اور سب سے کم سہ ماہی "معیار" جس کی تین یا پانچ کاپیاں یہاں آتی ہیں۔ تین ہزار "شمع" کی کاپیاں ہر ماہ وادی میں بکتی ہیں۔ شمع زیادہ فروخت ہونے کی بڑی وجہ شمع معمہ ہے۔ وادی سے ہزاروں لوگ ہر ماہ شمع معمہ بھیجتے ہیں اور ہر حل کے ساتھ رسالے سے کاٹا ہوا ایک کوپن بھیجنا لازمی شرط ہے۔ شمع کی مانگ کی دوسری بڑی وجہ اس کے فلمی فیچر ہیں۔ اگرچہ شمع میں کچھ ادبی کہانیاں بھی چھپتی ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ ان

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کہانیوں کو پڑھتے ہیں۔ شمع کے علاوہ دوسرے فلمی رسائل "روبی" فلمی تصویر" کہکشاں" "سب رنگ" اور فلمی ستارے بھی چلتے ہیں۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سرینگر میں جہاں قارئین زیادہ تر فلمی رسائل کے شایق ہیں، وہاں بارہ مولہ، سوپور، اننت ناگ اور دوسرے قصبوں میں مذہبی رسائل پڑھتے ہیں۔ ماہنامہ تجلّی، دین و دنیا، ہدیٰ، الحسنات جیسے مذہبی جرائد کی فروخت ہونے والی محدود کاپیاں زیادہ تر ان قصبوں میں بکتی ہیں۔

ذیل میں اردو رسائل کے نام اور یہاں کتنی کاپیاں آتی ہیں، ان کی تعداد دی جاتی ہے۔

فلمی رسایل

۱، شمع تین ہزار کاپیاں

۲، روبی چھ سو کاپیاں

۳، فلمی تصویر دو سو کاپیاں

۴، سب رنگ (بمبئی) دو سو کاپیاں۔

۵، کہکشاں ڈیڑھ سو کاپیاں

۶، فلمی ستارے سو کاپیاں۔

مذہبی رسایل

۱، ھدیٰ ڈھائی سو کاپیاں

۲، تجلّی ڈیڑھ سو کاپیاں

۳، پاکیزہ ایک سو ساٹھ کاپیاں

۴، دین و دنیا ساٹھ کاپیاں

۵، سب رنگ (دہلی) ڈیڑھ سو کاپیاں

۶، الحسنات پچھتر کاپیاں

۷، ذکریٰ چالیس کاپیاں

۸، حجاب تیس کاپیاں

۹، اسلام اور عصرِ جدید تیس کاپیاں

۱۰، الرسالہ پچاس کاپیاں

ڈائجسٹ

۱، شبستان چار سو کاپیاں

۲، ھما چار سو کاپیاں

۳، علمی انتخاب ڈیڑھ سو کاپیاں

ادبی رسایل

۱، بیسویں صدی ایک سو پچیس کاپیاں

۲، شاعر اسّی کاپیاں

۳، شب خون پچھتر کاپیاں

۴، آج کل پچھتر کاپیاں

۵، گفتگو پچاس کاپیاں

۶، شعر و حکمت پچاس کاپیاں

۷، صبحِ ادب ساٹھ کاپیاں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

۸،	شگوفہ	بیس کاپیاں	۲،	خاتونِ مشرق	تیس کاپیاں
۹،	تحریک	پندرہ کاپیاں	۳،	بتول	چالیس کاپیاں
۱۰،	نیرنگ	بیس کاپیاں		بچوں کے رسائل	
۱۱،	سطور	پندرہ کاپیاں	۱،	کھلونا	ستر کاپیاں
۱۲،	الفاظ	دس کاپیاں	۲،	نور	پچاس کاپیاں
۱۳،	معیار	دس کاپیاں	۳،	ہلال	پندرہ کاپیاں
۱۴،	سو برس	ساٹھ کاپیاں		متفرق	
	عورتوں کے رسائل		۱،	الفتح	بیس کاپیاں
۱،	بانو	پچھتر کاپیاں	۲،	سائنس کی دنیا	تیس کاپیاں

اِن کے علاوہ چند جاسوسی پرچے بھی آتے ہیں اور ہر ہفتہ چالیس پچاس کاپیاں بِک جاتی ہیں ۔

آج کل مختلف رسائل نے خاص نمبر شائع کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ جیسے شخصیات نمبر، کہانی نمبر، ناولٹ نمبر وغیرہ اس سے قارئین کے مختلف طبقوں کا ذوق پورا ہوتا ہے۔ اور رسالہ بھی زیادہ فروخت ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ایجنسیاں رسالہ ہذا کی زیادہ کاپیاں پیشگی لیتی ہیں ـــــ ریاستی محکمہ اطلاعات کے اہتمام سے ماہنامہ "تعمیر" نکلتا ہے اور کلچرل اکیڈمی اردو میں "شیرازہ" کے نام سے ایک ادبی رسالہ نکالتی ہے[1]۔ یہ رسائل عام طور بازار میں نہیں آتے ہیں۔ اور ادیبوں، علم دوست حضرات اور سرکردہ افراد میں تقسیم ہوتے ہیں ۔

بچوں کے ادب کی طرف والدین مجرمانہ حد تک غفلت برتتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں ہر سال بچوں کے لئے ہزاروں کتابیں لکھی جاتی ہیں اور بیسیوں رسالے نکلتے ہیں۔ جو انکھوں کی

---

[1] یہ رسالہ کلچرل اکادمی کے دفتر سے مِل سکتا ہے۔ (ادارہ)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تعداد میں بکتے ہیں۔ یہاں اردو میں بچوں کے لئے دو یا تین رسالے آتے ہیں اور ساری وادی میں ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں بکتے۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ بہت سارے والدین اپنے بچوں کو اچھے سکولوں میں تعلیم دلاتے ہیں اور ہر ماہ ایک بچے پر پچاس ساٹھ روپے خرچ کرتے ہیں لیکن وہ ایک روپیہ صرف کر کے بچوں کا ایک رسالہ نہیں خریدتے۔

اسی طرح عورتوں کا رسالہ ماہنامہ بانو لیجیئے۔ اس میں امور خانہ داری، کشیدہ کاری، بچوں کی تربیت اور عورتوں کی جسمانی صحت، نسائیت اور حسن کی حفاظت وغیرہ سے متعلق معیاری اور کارآمد مضامین اور فیچر چھپتے ہیں۔ اگر صوری لحاظ سے نہیں تو معنوی اور مواد کے لحاظ سے "بانو" انگریزی میں نکلنے والے کسی بھی معیاری رسالہ سے کم نہیں ہے لیکن وادی میں اس کی پچیس کاپیاں فروخت ہوتی ہیں۔ اس طرح طنز و مزاح پر اردو کا واحد رسالہ "شگوفہ" بھی بہت کم بکتا ہے ــــ مذکورہ رسائل میں پانچ چھ کے بغیر سارے رسائل دہلی سے نکلتے ہیں۔

جس طرح مارکیٹ میں چیزوں کے داموں میں اتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ اسی طرح رسالوں کی مانگ میں بھی نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ ابھی تک تو وادی میں فلمی رسالوں اور ڈائجسٹ جریدوں کا بازار نسبتاً مندہ بتایا جاتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر رسالوں کی فروخت میں خاص اثر نہیں پڑا ہے۔

اس امر کا ذکر یہاں غالباً بے جا نہ ہوگا کہ لیہہ جیسے چھ سات ہزار نفوس کی آبادی کے قصبے میں ہر ماہ شبستان کی پچاس ساٹھ کاپیاں بکتی ہیں۔ اس تناسب سے وادی میں چار ہزار کاپیاں شبستان کی بکنی چاہئیں تھیں۔ شمع، بیسویں صدی، بانو کی فروخت میں بھی لیہہ اور وادی میں لگ بھگ یہی تناسب رہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ وادی میں اگرچہ ہندی جاننے والوں کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے لیکن ہندی قارئین کی تعداد کافی ہے۔ آپ کسی بھی بک سٹال پر جائیے آپ کو انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی کے بہت سارے رسائل اور کتابیں فروخت کے لئے نظر آئیں گی۔ بچوں کے کئی دلچسپ رسائل جیسے لوٹ پوٹ، دیوانہ، چندا ماماں اور چمپک ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ ایک ادبی رسالہ "سرتیا" کی ہر ماہ چھ سو کاپیاں اور ایک ڈائجسٹ "اسیتہ کتھا" کی دو سو کاپیاں فروخت ہوتی ہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ایک اندازے کے مطابق وادی کے تمام کتب فروشوں کی دکانوں پر اردو میں روزانہ دس بارہ سے زیادہ کتابیں نہیں بکتیں۔ اگر لائبریریاں کتابیں خریدنا بند کر دیں تو یہ دکانیں ہی بند ہو جائیں گی۔

اردو رسالوں کی کس مپرسی اور بے بسی قابلِ رحم ہے۔ اکثر اردو رسائل کی عمرِ طبعی بہت کم ہوتی ہے۔ اردو کے کسی نئے رسالے کا پہلا شمارہ بڑی آب و تاب کے ساتھ جب ہمارے ہاتھوں میں آتا ہے تو ذہن میں سب سے پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ کتنے ماہ کے بعد بند ہو جائے گا —!

سری نگر میں علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے کئی نوجوانوں نے متعدد بار ایک ادبی رسالہ کے اجرا کی کوشش کی لیکن ایک، یا دو چار شماروں کے بعد یہ رسالہ ہمیشہ قعرِ گمنامی میں چلا گیا۔ اس کی وجہ ادب سے لوگوں کی بے اعتنائی ہے۔

پچھلے دنوں دہلی سے یہاں ایک نیوز ایجنسی کو آرڈر کے بغیر ماہنامہ "سو برس" کی دو سو کاپیاں بھیجی گئی تھیں۔ رسالے کے مدیر کو یہ خوش فہمی تھی کہ ا۔دو ریاست کی تہذیبی اور سرکاری زبان ہونے کے ناطے ساری کاپیاں بک جائیں گی۔ جب دو ماہ بعد پندرہ کاپیاں فروخت ہوئیں اور رسالہ ہذا کے پونے دو سو سرورق کاٹ کر بطور ثبوت واپس بھیجے گئے تو مدیر کی آنکھیں کھل گئیں۔

بہت سارے لوگ فراخ دلی سے بہت پیسے خرچ کر کے فلموں سے انبساط حاصل کرتے ہیں۔ لیکن پڑھنے کا شوق رکھتے ہوئے بھی وہ رسائل یا کتابیں خریدنے میں غیر معمولی بخل سے کام لیتے ہیں۔ وہ کتاب یا رسالے کو مانگے کا اجالا سمجھ کر مفت ہی پڑھنا چاہتے ہیں۔

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ اگر ایک اردو داں ماہانہ صرف ایک روپیہ اردو کا کوئی رسالہ یا کتاب خریدنے پہ صرف کرے تو یہ اردو کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جیوتیشور پتھک

جموں کی پہاڑی تہذیب

اور

یونانی بودھ اثرات

ڈوگرہ پہاڑی علاقے کا تہذیبی ورثہ تاریخ کے دھندلکوں میں کھو کر رہ گیا ہے۔ یہ بات نہیں کہ یہاں پر انسانی زندگی کا وجود نہیں تھا یا یہاں کے رہنے والے اس قابل نہیں تھے کہ انکے بارے میں کچھ لکھا جائے مگر تاریخ دانوں نے اس بارے میں کہنے اور لکھنے کے معاملے میں یقینی طور پر بخل سے کام لیا ہے۔ چنانچہ جب ایک محقق کو اس سنگلاخ سرزمین کے ماضی کی تلاش کرنا پڑتی ہے تو وہ گہرے دھندلکوں میں کھو کر رہ جاتا ہے بعض اوقات تو لوک کتھاؤں اور مقامی لوک داستانوں سے یہ اندھیرا اور کبھی مہیب ہو جاتا ہے۔ مگر حالیہ چند برسوں کے دوران اس علاقے کے تاریخی اور تہذیبی ورثہ کے بارے میں بہت ہی اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اور اس موضوع پر تحقیق کا عمل پیش رفت کرنے لگا ہے۔ اور اس سنگلاخ دھرتی کی خاموش چٹانوں کو زبان ملنے لگی ہے۔ اس موضوع پر سکندر کے ساتھ آنے والے مورخین ڈایوڈرس اور سٹریبو نے اپنے سفرناموں میں لکھا ہے۔ بعد ازاں ہیون سانگ کے سفرنامے میں بھی راجوری، پونچھ اور چناب کے مغربی کنارے کے علاقوں کی زندگی کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے۔ اسی طرح ایک محقق اس موضوع پر ملنے والے مواد۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تاریخ کی کڑیاں کچھ حد تک جوڑ سکتا ہے۔ مگر ڈایوڈرس اور سٹرابیو نے اپنے سفرناموں میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے اس بارے میں سن یا حکمران کا ذکر نہیں ملتا بلکہ اس نے اس سرزمین اور عوام کے بارے میں چند اہم اشارے ضرور دیئے ہیں۔ جو کہ ایک محقق کیلئے کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ہیون سانگ نے راجوری کی مملکت کے بارے میں جو کچھ لکھا اس میں یہاں کے لوگوں کے رہن سہن، سلوک، نظریات، نسل اور دیگر باتوں کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے۔ یونانی اثرات کے بارے میں مکرنڈل کی کتاب "انویژن آف انڈیا بائی الیگزینڈر دی گریٹ" میں یہاں کی پہاڑی مملکتوں کے بارے میں واضح طور پر تذکرہ ملتا ہے بعد ازاں جارج کنگھم نے "اینشنٹ جیوگرافی آف انڈیا" میں ان علاقوں کے حالات سے محل وقوع اور دیگر تفصیلات کی وضاحت کی ہے۔ اسی طرح تاریخی اور جغرافیائی پس منظر کے اس علاقے کے حالات سے پردہ اٹھانے میں کسی قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

یونانی مؤرخوں نے سکندر کے عہد میں پنجاب کے گردو پیش کے رقبہ میں صرف سلطنتوں کا ذکر کیا ہے ——— ایک ابھیسیار اور دوسری پورس کی مملکت۔ جہلم اور چناب کے درمیان کے علاقہ کو انہوں نے گلاسائی کا نام دیا ہے۔ ارجن داس ملک نے اپنی کتاب "الیگزینڈر دی گریٹ" میں ابھیسیار مملکت کا احاطہ جموں اور ہزارہ کے درمیان کیا ہے مگر بہت سے محقق اس بات سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ اکثر مؤرخ ابھیسیار کو پونچھ کا علاقہ قرار دیتے ہیں۔

یونانی مؤرخوں نے ہندوستانی دریاؤں کے نام الگ رکھے تھے جہلم کو انہوں نے ہائیڈسپز (HYDESPES) اور چناب کو آسکنی (AKSINI) سے موسوم کیا ہے۔ اسی طرح راوی اور ستلج کے نام بھی انہوں نے الگ الگ رکھے تھے۔ ان سفرناموں میں دی گئیں تفصیلات کے مطابق سکندر نے دریائے جہلم جلال آباد کے قریب عبور کیا۔ جہاں اسکا پیارا گھوڑا اہم ملک عدم ہو گیا اور سکندر نے اسکی یادگار بنوائی۔ پورس کی مملکت جہلم اور چناب

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کے علاقوں کے درمیاں تھی اور جہلم اور چناب کے درمیان کا علاقہ پونچھ کا علاقہ ہے۔ میرپور کوٹلی تحصیلوں کا علاقہ ہے اور اس بات سے تو سبھی لوگ اتفاق کرتے ہیں کہ جموں وکشمیر کا کچھ حصہ پورس کی مملکت میں شامل تھا۔ سکرنڈلی اور ارجن داس ملک کی کتابوں میں دیئے گئے تذکرے کے مطابق سکندر کے ساتھ جنگ کے وقت ابھیسار کے راجہ نے (افسوس کہ اس کا نام ان تذکروں میں نہیں ملتا) سکندر کے پاس اپنا سفیر بھیجا اور اس کی اطاعت قبول کرنیکا اشارہ دیا مگر ساتھ ہی وہ پورس کی حمایت کیلئے بھی کوشش کرتا رہا۔ تاہم پورس کی حمایت ابھیسار کے راجہ کو بروقت حاصل نہ ہوسکی اور پورس نے جواب دیا تھا کہ ہماری ملاقات میدان جنگ میں ہوگی۔ جنگ کا وہ میدان جہاں سکندر اور پورس کا مقابلہ ہوا کوئی وسیع میدان نہیں تھا۔ بلکہ ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ علاقہ تحصیل مینڈھر کا علاقہ ہے اور عین ممکن ہے کہ اسی میدان میں یہ تاریخی جنگ ہوئی ہو، مگر بعض لوگ اس علاقہ کو بھمبھر کا علاقہ بھی قرار دیتے ہیں۔ بھمبھر کا علاقہ اس قدر پہاڑی اور دشوار گذار نہیں جہاں جنگ کرنا مشکل ہو اور دوسرے سکندر نے دریائے جہلم میدانی علاقوں سے تقریباً ۱۸ میل اوپر جاکر عبور کیا تھا۔ لہٰذا اس بات پر اعتبار کیا جاسکتا ہے کہ یہ جنگ انہی علاقوں میں ہوئی تھی دوسرے جب سکندر واپس ہوا تو اس نے دریائے جہلم کے کنارے کشتیاں تعمیر کیں۔ اور ان کیلئے چیڑ اور شیشم کے درختوں کی لکڑی استعمال میں لائی گئی ہے۔ یہ لکڑی بھمبھر اور کالی دھار کے علاقے کے بجائے ضلع پونچھ کے جنگلات میں پائی جاتی ہے جبکہ بھمبھر اور اسکے نواحی علاقوں میں بیر، کیکر اور دوسری اقسام کی لکڑی پائی جاتی ہے جو کہ تعمیرات کے لئے موزوں نہیں۔ یونانی مؤرخوں نے جہلم اور چناب کے درمیان جس علاقے کو گلاسائی کا نام دیا ہے۔ وہ غالباً یہی سرزمین ہے جیسے موجودہ زمانے میں ڈوگرہ دیش کا نام دیا جاتا ہے۔ سکرنڈل کی کتاب "انویشن آف انڈیا بائی الیگزینڈر دی گریٹ" میں دستیاب تفصیلات کے مطابق گلاسائی مملکت ایک خوشحال مملکت تھی۔ اس میں چھوٹے بڑے ۳۷ قصبے آباد تھے۔ جن میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

چھوٹے سے چھوٹے قصبے کی آبادی ۵ ہزار تھی۔ اور بڑے حصّوں کی آبادی دس ہزار یا اس سے زیادہ نفوس پر مشتمل تھی۔ دریائے چناب کو عبور کرنے کے بعد سکندر راوی کے کنارے جا پہنچا جہاں سانگل (سیالکوٹ) ایک بہت بڑا شہر تھا۔ سانگل کا ذکر بعد ازاں بودھ مت پر تحقیق کرنے والوں نے کیا ہے۔ قدیم زمانے میں اس شہر کو شیبلہ کوٹ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے بعد ازاں جن کتب میں اس کا ذکر ملتا ہے انکے مطابق سکندر اعظم کے بعد سیالکوٹ اور گرد و نواح کے علاقے پر کچھ یونانی راجہ حکومت کرتے تھے۔ یہ لوگ کچھ عرصہ یونانی رہے۔ بعد ازاں انہوں نے بدھ مت اختیار کیا اور بدھ مت کے زوال کے بعد یہ راجے ہندو بن گئے۔

تقریباً ۲۵،۲۰ برس قبل بدھ مت سے متعلق ایک کتاب بدھ مت کے ۲۵۰۰ سال انگریزی زبان میں مرکزی محکمہ اطلاعات و نشریات کی طرف سے شائع کی گئی تھی جس کا دیباچہ آنجہانی صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن نے تحریر کیا ہے۔ بدھ مت کے ۲۵۰۰ سال کے ایک مضمون میں ایک ایسے ہی یونانی راجہ مینیدر کا ذکر ملتا ہے۔ یہ راجہ یونانی تھا اور اسکو بدھ مت سے متعلق معلومات کا بھاری تجسس تھا۔ مگر کوئی بھی عالم اسکو دلیل اور دعوے سے قائل نہیں کر پا رہا تھا۔ آخر اس کی ملاقات ایک بدھ بھکشو ناگ سین سے ہوئی۔ جسکے ساتھ اسکا تبادلہ خیال ہوا اس بحث و مباحثے کی بدولت راجہ مینیدر نے بدھ مت اختیار کیا۔ ناگ سین کشتواڑ کا رہنے والا تھا۔ پروفیسر محی الدین حاجنی، عشرت کاشمیری اور دوسرے چند لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی بحث و تمحیص کے بارے میں جو کتاب ملند اپنہا لکھی گئی ہے وہ قدیم کشتواڑی زبان میں ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب پالی یا سنسکرت میں ہے۔ ان حالات میں یہ بات عین ممکن ہے کہ ضلع پونچھ میں مینڈھر کے قصبہ کا نام ملیندر کے نام پر پڑا ہو اور یہ وہی علاقہ ہے جہاں پر ناگ سین اور ملیندر کے درمیان تبادلہ خیالات ہوا ہے۔ ان علاقوں میں بودھ اور یونانی اثرات کے بارے میں ماخذ اب نایاب ہیں۔ البتہ مقامی لوگوں کے مطابق پونچھ کے قریب اجوٹ کے کھیتوں میں کسانوں کو کچھ پرانے کھنڈرات دستیاب ہوئے ہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

یہاں پر تحقیق کی بھاری گنجائش موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاپوڈرس کا مسٹر ہیو نے جن شہروں کا اپنے سفرناموں میں ذکر کیا ہے انکے بارے میں کچھ واقفیت حاصل ہو سکے تاہم اکھنور کے قریب انبیاراں کے مقام پر ۱۹۴۷ء کے اس پاس آثار قدیمہ کے چند نمونے حاصل ہوئے ہیں۔ ان نمونوں (ٹراکوٹاز) کی اساس پر اخبار سٹیٹسمین کے چارلس فبری نے رسالہ مارگ (مارچ ۱۹۵۵ء) میں ایک مضمون سپرد قلم کیا۔ جس میں ان نمونوں یعنی — TERACOTAS کی تاریخی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے ڈاکٹر فبری کے مطابق یہ نمونے ۷۰۰ سے لیکر ۳۰۰ عیسوی کے عرصہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر فبری نے لکھا ہے کہ دریائے چناب کے کنارے شہر اکھنور اور انبیاراں آباد ہیں یہ لازمی طور پر تاریخی افادیت کے مقامات ہوں گے جہاں پر یونانی اثرات کی گہری چھاپ ہے آرتھر نیگ ہسنٹن کی کتاب کشمیر کے مطابق بھی پنجاب اور اس کے نواحی علاقوں میں یونانی اور بدھ فن کی گہری چھاپ ملتی ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیاح ہیون سانگ جب جموں و کشمیر کے دورے پر آیا تو وہ دو سال یہاں پر رہا۔ چوتھی دہائی کے اس عرصہ میں اس نے جن علاقوں کا سفر کیا ان میں پونچھ اور راجوری کا واضح طور پر ذکر ملتا ہے۔ اس تذکرے کی جغرافیائی تفصیلات جارج کننگھم نے اینشنٹ جیوگرافی آف انڈیا میں دی ہیں — اس کتاب کے مطابق "پار۔ تا۔ لشو" کا جو علاقہ درج ہے وہ پونچھ ہے۔ اس کتاب کے مطابق یہ علاقہ زرخیز ہے۔ یہاں پر گندم اور پھلوں کی کاشت ہوتی ہے گنے کی پیداوار ہوتی ہے اور لوگوں نے اپنی جھونپڑی کے ساتھ باغیچے قائم کئے ہیں۔ چند علاقوں کی آب وہوا گرم بھی ہے۔ یہ علاقہ انتظامی امور میں کشمیر کی سلطنت کے ماتحت ہے۔ علاقہ میں دس یا بارہ بودھ بیٹھ ہیں۔

بودھ کی تفصیلات کے تحت درج ہے کہ یہ علاقہ پار۔ تا۔ لستو کا نواحی علاقہ ہے اور آب وہوا کے لحاظ سے گرم ہے۔ لوگوں کا رنگ سیاہ مائل ہے۔ یہ لوگ لب ولہجہ کے سخت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہندوستانی نہیں بلکہ غیر ہیں تاہم یہ علاقہ کشمیر کے ماتحت ہے۔
یہاں پر بدھ مت کے پیرو نہیں ملتے یہ لوگ ہندو دھرم کے پیروکار ہیں۔ جالسج کننگھم نے
اس علاقے کو راجوری کا علاقہ قرار دیا ہے۔ ویسے بھی آب و ہوا کے لحاظ سے یہ علاقہ زیادہ
ترکنڈی علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ جہاں شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ زمین پتھریلی ہے۔
اور زہریلے سانپوں کی بہتات ہے۔ تاریخ جدید ڈوگرہ دیش کے دیباچہ میں دیا کرشن گردش نے
ہیروڈوٹس کا حوالہ رقم کیا ہے۔ ہیروڈوٹس کی ایک روداد کے مطابق جمہوریت کا مقصد
بھی جموں کی سنگلاخ دھرتی سے یونان تک پہنچا اور یونان سے دنیا کے دوسرے گوشوں
نے حاصل کیا۔ ولادت مسیح سے ۵۱۷ برس قبل دارا اوّل نے ایک یونانی جرنیل سکائی لیکس
کی قیادت میں ایک مہم ہندوستان بھیجی تاکہ وہ فارس کیلئے سمندری راستے کا سراغ لگائے اور
تجارتی امکانات کا جائزہ لے۔ سکائی لیکس اور اس کے ساتھی شمال کی طرف بڑھتے بڑھتے اس
جگہ پہنچے جہاں چندر بھاگا پہاڑوں سے میدانوں میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں سانپ بہت ہیں اور
خوفناک قسم کے بچھو بھی ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک لاش جلائی جارہی تھی اور ایک
بڑھیا زار و قطار رو رہی تھی۔ سکائی لیکس نے اس سے پوچھا تم کیوں رو رہی ہو بولی"، بڑھیا "میرے
اکلوتے بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ مر گیا۔ اب میرا اس دنیا میں کوئی نہیں"۔

سکائی لیکس :۔ اکلوتے بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا۔ ہمارے یونان میں تو کبھی کوئی آدمی سانپ
کے ڈسنے سے مرا نہیں ہم نے فارس میں بھی پچھلے آٹھ برسوں میں کوئی ایسی بات سنی نہیں۔

عورت :۔ مگر ہمارے گاؤں میں سانپ بہت ہیں اور بڑے زہریلے ہیں۔ پہلے میرے سسر کو سانپ نے
ڈس لیا تھا وہ مر گیا پھر میرے شوہر کو اور اب میرا جوان اکلوتا بیٹا۔

سکائی لیکس :۔ تب تو بہت خطرناک ہے یہ ملک۔ یہاں زیادہ تر لوگ سانپ کے ڈسنے سے مرتے
ہیں تم نے تو اس ملک کو چھوڑ کیوں نہیں دیا۔ بہت وسیع ہے ہمارا ملک تمہارے ملک کی طرح کوئی
چھوٹا نہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

عورت :۔ اس لئے چھوڑا نہیں کہ یہاں جنتا کا اپنا راج ہے یہاں گڈریئے کی طرح دوسروں کو نہیں ہانکا جاتا۔ یہاں سب لوگ مل جل کر قانون تیار کرتے ہیں اور خود اس پر عمل کرتے ہیں۔

سکائی لیکس :۔ مگر یہ موت ؟ قدم قدم پر رینگنے والی کالی موت! کیا تمہیں اس سے ڈر نہیں لگتا۔ ہم نے خود راندوارتھ میں کتنے ہی سانپ دیکھے ہیں۔

عورت :۔ ایک نہ ایک دن سب نے مرنا ہے۔ جسے سانپ نہیں ڈسے گا وہ کسی روگ سے تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ موت سے ڈر کر زندگی بھر کیلئے اپنی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں دے دینا اور خود بھیڑ بکریاں بن جانا عمر بھر کا روگ مول لینے کے مترادف ہے۔ دنیا میں کہیں راجے ہیں کہیں گن تنتر ہیں کہیں دو راجاتی یعنی دو عملی ہے ہمیں اپنا گن تنتر ہی پسند ہے۔ جہاں کوئی کسی کا محکوم نہیں جہاں سب برابر ہیں۔

سکائی لیکس :۔ سن رہے ہو زیوٹرس (ZIOTRUS) یہ دیوی کہتی ہے کہ فرد واحد کی حکومت زہریلے سانپ کے ڈنک سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ کاش! یونان کے لوگوں کو بھی یہ راز معلوم ہوتا ہم کبھی تو ایسے حکمران کے ڈنک سے بچنے کیلئے ہی اپنے ملک سے بھاگ کر نکلے تھے۔ اور دارا اوّل کے دربار میں پناہ لی تھی۔

زیوترس :۔ اس دیوی نے ہمیں زندگی کا ایک نیا راستہ دکھایا سکائی لیکس!

سکائی لیکس :۔ بے شک ایک نیا راستہ ہے یہ بالکل نیا راستہ۔ سنو دیوی آج سے سکائی لیکس تمہارا منہ بولا بیٹا ہوا۔ تم ہمارے ساتھ یونان چلو اور یہی راز یونانی بیٹوں کو بتاؤ جمہوریت کا راز! ایک نئی زندگی کا راز۔!!

سکندر کے حملے کے وقت سٹربو نے جو سفرنامہ لکھا ہے اس میں جن علاقوں کی جمہوریت کا ذکر آیا ہے یہ علاقہ آجکے کٹھوعہ اور بسوہلی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان تذکروں کے مطابق جو لوگ بعد ازاں جنگ میں شہید ہو گئے تھے ان کی عورتوں نے مجموعی طور پر پالتی کوئی (یعنی بسوہلی میں) جوہر کی رسم سرانجام دی تھی۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سی۔ بی باپٹ کی کتاب بدھ مت کے ۲۵۰۰ برس میں میندر وہار کا ذکر آیا ہے۔ مگر اس وہار کا محل وقوع درج نہیں عین ممکن ہے کہ یہ میندر وہار میندھر میں ہی واقع ہوا۔ کیونکہ ہیون سانگ کی کتاب ٹریولز آف یانگ سو میں لکھا ہے کہ پونچھ کے علاقہ میں ایک درجن کے قریب بدھ وہار ہیں۔ چنانچہ یہ بات قابل اعتبار ہو سکتی ہے کہ میندر وہار اسی علاقے میں موجود رہو۔

علاوہ ازیں علاقہ سنی میدان میں پتھروں کی قطاریں اس طرح ترتیب شدہ ملتی ہیں گویا یہ کوئی قدیم میدان ہو۔ رام کنڈ لکشمن کنڈ اور سیتا کنڈ کی باولیاں قدیم ہندو فن تعمیر کا ایک نمونہ ہیں۔ حالانکہ مقامی لوگ ان کا رابطہ پانڈوؤں سے جوڑتے ہیں۔ سنی میدان کے علاقہ میں قدیم شہر کے کھنڈرات بھی دستیاب ہوئے ہیں مگر سن اور سال کے یقین کیلئے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ پانچ سروں کی جو مورتیاں یہاں برآمد ہوئی ہیں اُنکے بارے میں خیال ہے کہ یہ ہندو دور کی ہیں مگر اُن کے جائزے سے ان پر یونانی فن کا اثر معلوم ہوتا ہے

معاون کتب

۱:۔ انویژن آف انڈیا بائی الیگزینڈر دی گریٹ   مکرنڈل

۲:۔ ٹریولز آف یانگ سو

۳:۔ الیگزینڈر دی گریٹ ۔   ارجن داس ملک

۴:۔ بدھ مت کے ۲۵۰۰ سال (انگریزی) مدیر سی۔ وی باپٹ

۵:۔ رسالہ بھارگ   چارلیس فیری کا مقالہ

۶:۔ تاریخ ڈوگرہ دیس ۔   نرسنگھ داس نرگس۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مظفر حنفی

○

تاروں کے چلے تیر لگاتار ہمیں پر
ذرا کے گری ریت کی دیوار ہمیں پر
نمرود کریں آگ کی بوچھار ہمیں پر
رحمت نہ کشادہ کرے گلزار ہمیں پر
آئندہ کے خدشات کا ہر وار ہمیں پر
بیتے ہوئے لمحات کی یلغار ہمیں پر
ہاں سینہ سپر ہم تھے اندھیروں کے مقابل
چلتی رہی خورشید کی تلوار ہمیں پر
ہاتھوں کی لکیروں نے بُنا جال ہمارا
اپنے ہی جوان خون کی پھٹکار ہمیں پر
مستول پہ لہرا کے ہمیں ناؤ چلائیں
بپھری ہوئی آندھی کی کڑی مار ہمیں پر
یاروں کے لئے ہم تو صلیبوں سے نہ جھجکے
یاروں نے مگر کھینچ دیئے دار ہمیں پر
چبھتی ہے کرن آکے تو سینے میں ہمارے
گرتی ہوئی شبنم ہے گراں بار ہمیں پر
تخلیق کی دُھن میں کبھی سوچا نہ مظفر
برسائیں گے شعلے یہی اشعار ہمیں پر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مدحت الاختر

○

لوح روشن نہ ہوئی مرحلہ طے کیسے ہو
اب اسی کرب کے عالم میں رہو جیسے ہو

آنکھ ملتے ہوئے دیکھا تو عجوبہ نکلے
خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم ایسے ہو

دل کی حالت تو چھپائے نہیں چھپتی لیکن
کم سے کم پوچھ لیا ہوتا کہ تم کیسے ہو

سو سمندر بھی اب آنکھوں سے بہیں کیا حاصل
"جو شجر سوکھ گیا ہے وہ ہرا کیسے ہو"[1]

آج یوں اس سے خفا ہو کے چلا آیا ہوں
اپنے ہی عکس سے آئینہ خفا جیسے ہو

---

[1] شہزاد احمد

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مرغوب بانہالی

کشمیر ــ ریشیت اور تصوف

۱۔ ریشیت کیا ہے؟ کیا ایک روحانی مسلک کی حیثیت سے اس کا کوئی مستقل نظام عمل رہا ہے؟

۲۔ کیا ایک روحانی مسلک کے طور پر کشمیر سے باہر بھی کہیں ریشیت کا رواج رہا ہے؟

۳۔ کیا کشمیر میں ریشیت مسلمان مبلغوں اور صوفیوں کے زیر اثر وجود میں آئے ہوئے قدیم ہندو ریشیوں اور منیوں کے طریق ریاضت کی احیاء و ارتقار کا نام ہے؟

۴۔ کیا ریشیت "ریشی وآر" کہلانے والی وادیٔ گلپوش میں ہندو ریشیوں کی رہبانیت اور مسلمان صوفیوں کی دروں بینی اور عدم تشدد کے امتزاج کا نتیجہ ہے؟

۵۔ کیا ریشیت تصوف کے مختلف سلسلوں کی طرح کا کوئی مستقل سلسلہ گردانا جاسکتا ہے؟

۶۔ کیا ریشیت کو کشمیر کے منفرد مسلک عرفان کی حیثیت سے تصوف کا نعم البدل گردانا جاتا ہے؟

۷۔ کیا ریشیت تصوف کی پروردہ ہے؟

۸۔ کیا کشمیر کی ریشیت میں غیر اسلامی فکر و فلسفہ اور رہبانیت کا اسی تناسب سے غلبہ پایا جاتا ہے۔ جس تناسب سے ایرانی تصوف میں بدھ مت، عیسائیت، ریشیت اور ویدانت کی راہبانہ باتوں کا درپردہ غلبہ محسوس ہوتا ہے؟

۹۔ کیا ریشیت قدیم ریشی پن کی ریاضت پر اسلامی زہد و تقویٰ کا رنگ چڑھ جانے سے وجود

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

میں آئی ہے۔

ریشیت اور تصوف میں کن کن باتوں کا اشتراک اور اختلاف پایا جاتا ہے؟ یہ اور اس طرح کے کئی دیگر سوال اس موضوع کو کافی دلچسپ بناتے ہیں۔ یوں بھی آج کل کشمیر میں ریشیت کے سب سے معروف اور درخشندہ مینار شیخ العالم علمدار کشمیر شیخ نورالدین نندہ ریشی کی یاد میں منائی جانے والی شش صد سالہ تقریبات کی بدولت ریشیت سے متعلق بڑی دلچسپ بحثیں اٹھانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان بحثوں کے تذکرہ میں حقیقت شناسی اختیار کرنے والوں کی تعداد بہت کم اور دور از کار تاویلات گڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ شاید اس لئے کہ کشمیر کے اس مقبول ترین شاعر اور مبلغ حضرت نندہ ریشی کے چند شعر صحیح یا غلط یاد رکھنے والا ہر شخص اپنے آپ کو ریشیت کا ماہر بلکہ بغیر ریاضت ہی اپنے آپ کو ریشیوں کے جادۂ ریاضت کا راہی جاننے لگا ہے۔ جس کا نتیجہ زحمت مطالعہ کے بغیر بحث کرنے والوں کی شیومت اور اسلام سے متعلق کج بحثی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اوپر دیئے گئے سوالات سے متعلق مختلف تذکروں میں درج اشارے بھی کج بحثی کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ کیونکہ بعض تذکرہ نویسوں کے بیانات بہر حال اس ضمن میں غور طلب اور تشریح طلب ہیں مثلاً:-

ا ــــ روضۃ الابرار میں ہندؤوں کے لفظ رشی کو کشمیری لفظ "ریشی" کا ماخذ قرار دیا گیا ہے۔[1]

خواجہ محمد اعظم کی "واقعات کشمیر" میں ریشیوں کی سب سے نمایاں خصوصیت گوشت نہ کھانے اور نفس کشی کرنے کو قرار دیا گیا ہے۔ ان دو تذکروں میں درج بیانات سے پیشتر ابوالفضل اور جہانگیر کے ملتے جلتے بیانات ریشیوں کے عقاید و اعمال سے متعلق کئی لحاظ سے غور طلب ہیں۔

---

[1] پروفیسر ایس ایل سادھو اس ضمن میں لکھتے ہیں۔ ریشی کی اصطلاح سنسکرت سے لی گئی ہے۔ انگریزی میں SEER کا لفظ معانی اعتبار سے اس کے بہت قریب ہے، ہندوستان کی قدیم تمدنی تاریخ میں یہ اصطلاح ان لوگوں کے لئے استعمال کی گئی ہے، جو خلوت نشین ہو کر باقاعدگی سے استغراق اور محویت کے عالم کو اپناتے تھے۔ اور سطرح سے اپنی ذات کو ماحول میں ضم کرنے کی کوششوں میں منہمک ہوتے تھے۔ (شیرازہ ثقافت نمبر ص ۲۱)

ان کے بیانوں کا خلاصہ یہ ہے کہ کشمیر میں فقیروں کا ایک طائفہ ہے۔ جن کو ریشی کہتے ہیں یہ لوگ بظاہر علم و عرفان نہیں رکھتے لیکن بے ریائی اور بے ساختگی کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ کسی کو برا نہیں کہتے۔ اپنی زبانِ خواہش اور اپنے پائے طلب کو روکے رکھتے ہیں۔ تاکہ عام لوگ ان سے بہرہ ور ہوں وہ ان درختوں کے میوے بھی خود نہیں کھاتے جو وہ سڑکوں کے کنارے دوسروں کو آسائش پہنچانے کی غرض سے خود لگاتے تھے۔ کتاب اسرار الابرار کے مولف نے بھی ریشیوں کے تعارف میں ایسے ہی بیان سے کام لیا ہے۔[1]

اس طرح کے سارے بیانات کے ردِ عمل میں بعض محققوں نے بڑی برہمی اور بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ ان بیانات کی روشنی میں ابھرنے والے ریشیت کے تصور کو واضح طور پر اسلامی تعلیمات کا پروردہ یا خالص رہبانیت کی پیداوار قرار دینے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اس دشواری سے دوچار ہونے والوں کی ترجمانی قاضی ناظم سہروردی نے اپنے اس بیان میں کی ہے۔ جو آپ نے جہانگیر اور مذکورہ بالا ادیبوں کے بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس طرح دیا ہے۔ اگر یہ بیانات صحیح ہیں تو خاکسار کو اس گروہ کے کمال میں تامل ہے۔ کیونکہ یہ طرز جوگیوں اور راہبوں سے ملتا ہے۔ اور یہ اس حدیث شریف کی زد میں آتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو جس قوم سے مشابہت پیدا کرے گا وہ اسی میں شمار ہوگا۔ اولیائے اسلام کا طریقہ اتباعِ سنت ہے۔ اسلام نے ترک حلال کو جائز نہیں رکھا ہے۔ بلکہ اس کی سخت ممانعت کی ہے۔ ایک مرتبہ رسولِ کریمؐ نے شہد کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اور ارادہ فرمایا تھا کہ کبھی استعمال نہ کریں گے اس پر اس مفہوم کی آیت نازل ہوئی کہ "اے نبی تو کیوں حرام کرتا ہے اس چیز کو جس کو خدا نے حلال کیا ہے" جب حضورؐ کو یہ حکم ہوتا ہے تو اور کسی کی کیا ہستی ہے۔[2]

---

[1] محمد امین کاملؔ نے ان اقتباسات کا متن اپنے انداز میں یوں پیش کیا ہے۔ ریشی لفظ سنسکرت کے "راکھی" لفظ سے ماخوذ ہے اس کا فارسی کے "دلریش" لفظ سے کوئی تعلق نہیں۔ 'ریشی' ان لوگوں کو کہا جاتا ہے۔ جو اپنی ریاضت سے خدا کا تجربہ اور گیان حاصل کرتے ہیں یہ لوگ عام طور پر بغیر شادی بیاہ اور بغیر گھر بار زندگی گذارتے ہیں۔ یہ لوگ گوشت نہیں کھاتے بلکہ صرف "کاسنی" اور "وو پل ہاک" جیسی کڑوی جنگلی سبزیوں پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ تنہا نشینی اور نفس کشی کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر شاعر ہوتے ہیں۔ (نور نامہ کشمیری ص ۲۶) لیکن کامل صاحب کا ریشی کو راکھی کا مشتق قرار دینا بھی محلِ نظر ہے اور اس کو دلریش سے جوڑنے والے کی نشاندہی نہ کرنا بھی عجیب۔

[2] نگارستان کشمیر ص ۲۰۴

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ریشیوں کے تعارف اور تنقید کی ذیل میں آنے والے یہ دو بیان ہمدردانہ تجزیے کا تقاضا کرتے ہیں۔ پہلے بیان کا تعلق اس بات سے ہے کہ ہندو لوگ اپنے کن خاص بزرگوں کو رشی کہتے رہے ہیں ۔ اگر خاص بزرگ سے مراد ایسا شخص ہے جو عارفانہ زندگی اختیار کر کے بھجن گاتا ہو یعنی ایسا شخص جو خدائے لم یزل سے اپنی نجات اور مکتی کے لئے کلام موزوں میں دعا مانگتا ہو تو اس لحاظ سے گویا خدا طلبی اور اپنی عافیت طلبی کی راہ اختیار کرنے کے لئے ایک خاص ذہنی جھکاؤ کے تحت مصروف دعائے نجات ہو جانا اور منظوم کلام سے ایک گونہ لگاؤ پیدا کرنا ہی ہندو مسلک عرفان میں رشی کہلانے کے لئے کافی سمجھا جاتا رہا ہے ۔

دوسری بات کا تعلق اتباع سنت سے ہے اور یہ سنت شرع کی پابندی مکمل طور پر اختیار کرنے کی متقاضی ہے ۔

یاایّھا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السّلم کافّۃً ولا تتّبعوا خطوٰت الشّیطٰن ہ الخ چناں چہ اس مقصد کی وضاحت کے لئے شیخ سعدی شیرازی کے اشعار کا سہارا بھی لیا ہے۔ جو شاید اس آیہ کریمہ کے زیر اثر کہے گئے ہیں ۔ قل ان کنتم تحبّون اللہ فاتّبعونی یحببکم اللہ ہ (یا رسول اللہ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ تو اس کا واحد عملی ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل پیروی کرنے میں ہے بلکہ یہی ثبوت ان کو ایسی اللہ کے محبوب اور اولیاء اللہ بنانے کا ضامن ہے) سعدی کے مذکورہ اشعار یہ ہیں ؎

خلاف پیمبر کسی رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
مپندار سعدی کہ راہ صفا
تواں یافت جز در پی مصطفیٰ
درین راہ جز مرد داعی نرفت
گم آں شد کہ دنبال داعی نرفت

۱؎ مجلہ علمدار سرینگر (نگارش پروفیسر حاجنی) ص ۱

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ریشیت کی راہِ عرفان پر ہی اس طرح تنقید کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ تصوف کے سلسلے میں بھی یہی ناقدانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ مثلاً اس ضمن میں حضرت مجدد الف ثانی کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔ "شریعت کے لئے ایک صورت اور ایک حقیقت یعنی ایک ظاہر اور ایک باطن کا پہلو ہے۔ ظاہر کا بیان کرنے کے ذمہ دار علمائے ظاہر ہیں۔ اور حقیقت یا باطن کے سلسلے میں صوفیا ممتاز ہیں۔ صوفیا میں سے بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے یہ سمجھا کہ ان کا قدم شریعت کی عمل آوری کی حدود کو پھاند چکا ہے اور وہ پوست کو چھوڑ کر مغز تک پہنچ چکے ہیں ۔۔ دراصل ایسا گمان ان صوفیوں کے قدم پھسلنے کی دلیل ہے۔ کیونکہ بہت سے ناقص صوفی یہیں سے الحاد و زندقہ میں جا گرتے ہیں اور انہوں نے شرع کی متابعت ترک کر کے اوروں کو بھی گمراہ کیا ہے ۔۔ ان دونوں ناقدانہ بیانوں میں بظاہر کسی چون وچرا کی گنجائش نہیں[1] البتہ راہ شرع پر کامل اتباع کا عملی ثبوت پیش کرنے والے صوفیوں بلکہ دونوں صوفیوں اور ریشیوں کے عظیم سربراہ مولانا رومیؒ ایسے مسائل میں غلط بحث کی عام سطح سے اوپر اٹھنے کی بہت عمدہ دعوت فکر یوں دی ہے کہ ؎

امر حق راہم بہ امر حق شکن

ہر زجاج دوست سنگ دوست زن

ایسے مسائل کی تفہیم کے لئے خاص ڈھنگ کی یعنی شرع کی بات کو شرع کی روشنی میں اجاگر کرنے دعوتِ فکر دینا اس لئے بھی ضروری سمجھا گیا کہ عملاً بار آور ہونے والا ہر بڑا انقلابی قدم پہلے فکر و شعور کی سطح پر واضح اور پختہ ہو گیا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا رومیؒ نے اپنے اس نظرئے کی صراحت کرتے ہوئے دوسری جگہ ایسے مباحث میں شعور کی پختگی حاصل کرنے کے بعد ہی دخل

---

[1] چنانچہ اس پس منظر میں علامہ اقبالؒ نے حافظ شیرازیؒ کے تصوف پر کڑی تنقید کی تھی اور پھر تنقید کے جواز کی وضاحت ایک خط میں یوں فرمائی تھی۔ "تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب فلسفہ تصوف بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے۔ تو میری روح اسکے خلاف بغاوت کرتی ہے (اقبال نامہ ج۔ ا، ص ۵۴ بحوالہ حافظ اور اقبال ص ۱۵)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

دینے کا مشورہ دیا ہے اور تنبیہ کے انداز میں فرمایا ہے۔ ؎

کار پاکان را قیاس از خود مگیر

گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

حالاں کہ شاعر مشرق اقبالؔ نے بھی اپنے مرشد رومیؔ کی طرح روشن نظری کی ضمانت عشق رسولؐ اور محبت اللہ کے والہانہ اظہار کو قرار دیتے ہوئے اس سلسلے میں ایک لمحۂ فکریہ پیدا کرنے کی کوشش اس طرح کی ہے ؎ اک شرع مسلمانی اک جذب مسلمانی ۔ ہے جذب مسلمانی سر فلک الافلاک اس شعر میں شرع کے حقیقی پہلو سے ہمکنار ہو کر اختیار کئے گئے جس جذب و شوق کو کنایتاً "سرفلک الافلاک" یعنی عرش اعلیٰ کا راز قرار دیا گیا ہے اصل میں یہی سر افلاک وہ نورانی نکتہ ہے جس کو اپنی جان سے پیارا جان کر صوفیوں اور ریشیوں نے عشق سے بھی تعبیر کیا ہے۔ بلکہ اسی نورانی نکتے پر اپنے وجود کو پروانہ وار قربان کرنے کا خلوص و ایثار انکے ہاں اس فنا کا نام ہے۔ جو سالک کے لئے بقا ۔ باللہ ہو جانے کا ضامن ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ عشق کی وابستگی کے ارتقائی مدارج کو بعض صوفیا نے فنافی الشیخ فنافی الرسولؐ اور فنا فی اللہ کے نام بھی دیئے ہیں۔ یہاں ہر یکتا پرستی کے مشترکہ رجحان کی موجودگی کے ناطے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مختلف ملکوں میں تلاش حقیقت سے وابستہ اس عشق نے وہاں کے اجتماعی میلانات کے مطابق اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق وقتاً فوقتاً مختلف روپ دھار لئے ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر اگر جذب و شوق کو عشق کے بین الملل عرفان کی بنیادی قدر مشترک سمجھا جائے تو ایران کے تصوف، ہندوستان کی بھگتی کی تحریک اور کشمیر کی ریشیت کو تلاش حقیقت کی ایک ہی تڑپ اور بے کلی کے تین روپ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ عوامل کی چند تفاوتوں کے باوجود اپنے اپنے گرد و پیش میں خونخوار انسانوں کے ہاتھوں انسانیت کی پامالیٔ اقتدار کی شکست وریخت اور مذہبی اجارہ داروں کے ہاتھوں سادہ لوحوں کا استحصال دیکھ کر تین مختلف خطوں میں تین مختلف وقتوں پر وہاں کے حساس ترین گروہ کے اجتماعی میلانات سے جو ردِ عمل ظاہر ہو سکتا تھا۔ وہ دردوں میں عرفان ذات اور عالمی بھائی چارے کے ملے جلے جذبات سے معمور نغموں اور بھجنوں کی شکل میں ہوا۔ جنہوں نے ان تین عرفانی مسلکوں کی تشکیل کا کام انجام دیا۔ تاریخ گواہ ہے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کہ مذکورہ جذبوں سے مملو ان مسلکوں کی جس طرح اپنے ملکوں میں پذیرائی ہوئی اس نے ان کو تین باضابطہ عرفانی اور اصلاحی تحریکوں کا روپ بخشا۔ مقامی اور محلی طور پر ان عرفانی مسلکوں کی پذیرائی اس لئے ہوئی تھی کہ خونخواری اور خوف و دہشت کی زد میں آئے ہوئے عوام ہمیشہ آدم گری کے مقاصد کا ساتھ دیتے تھے۔ تاریخی عوامل پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو توحید اور انسان دوستی پر مبنی ان تینوں تحریکوں میں اسلامی تعلیمات کی روح دوسری اہم ترین قدر مشترک کی صورت میں جلوہ گر نظر آئے گی۔ بعض سطحی مطالعہ کرنے والوں اور مصلحت اندیشوں نے اُلٹی سیدھی باتیں گڑھ کر جس ٹھوس حقیقت کو چھپانا چاہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا تین خطوں (جو قدیم زمانے میں تین الگ ملکوں کا درجہ رکھتے تھے۔ خاص طور پر یہ تحریکیں شروع ہونے کے وقت تک) میں اسلام نہ پہنچا ہوتا تو تصوف، بھگتی کی تحریک اور ریشیت نام کی یہ تحریکیں اس انداز میں ہرگز پیدا نہ ہوگئی ہوتیں۔ ان تحریکوں کے وجود میں آنے سے متعلق اُلٹی سیدھی باتیں گڑھنے میں مغربی عالموں کا بھی براہِ راست دخل رہا ہے۔ خاص طور پر تصوف سے متعلق مثلاً "ایرانی معاشرے میں آٹھویں اور نویں صدی کے بعد سے چنگیزی اور تیموری کشت و خون کے نتیجے میں پیدا ہوگئی ہوئی انسانی قدروں کی شکست وریخت کے ردعمل کا نتیجہ قرار دیا تو علامہ اقبال نے اسکی زوردار تردید کرنے کی ضرورت محسوس کی اور کتاب "فلسفۂ عجم" لکھنے کی تحریک پائی۔ موصوف اس کتاب میں رقمطراز ہیں۔

"ایرانی تصورات کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اس دلچسپ میدانِ تحقیق کے منکشفین نے ان مختلف راستوں کے انکشاف میں اپنی قابلیت صرف کردی جن سے گذر کر تصوف کے اساسی تصورات ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اِس اصول کو بالکل نظر انداز کردیا ہے کہ کسی قوم کے عقلی ارتقار کے کسی مظہر کی اہمیت صرف اُس وقت ذہن نشین ہوسکتی ہے کہ ہم اس قسم کے گذشتہ عقلی سیاسی و اجتماعی حالات کی روشنی میں اس پر نظر ڈالتے ہیں۔ خان کریمر اور ڈوزی نے ایرانی تصوف کا ماخذ ہندی ویدانیت کو

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ٹھہرایا ہے اور نکلسن اس کو نو فلاطونیت سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ پروفیسر براؤن نے یہ خیال کیا تھا کہ تصوف غیر جذبی سامی مذہب کے خلاف ایک آریائی ردِ عمل ہے۔ میرے خیال میں یہ تمام نظریات ایک ایسے تصورِ تعلیل کے تحت وضع کئے گئے ہیں جو قطعاً غلط ہے۔ ...... یہ ایک ایسا طرزِ استدلال ہے جس کو کوئی منطق جائز نہ رکھے گی۔ لہٰذا ہم ایک صحیح نظریۂ تعلیل کی روشنی میں اسلامی زندگی کے ان خاص خاص سیاسی، اجتماعی اور عقلی حالات کو پیش کریں گے۔ جو آٹھویں صدی کے اختتام اور نویں صدی کے نصف اوّل میں پائے جاتے تھے۔ صحیح معنوں میں اسی زمانہ میں زندگی کا صوفیانہ نصب العین وجود میں آیا اور اسکے بعد ہی اسی نصب العین کا فلسفیانہ جواز بھی پیش کیا گیا"۔

اس تمہید کے بعد علامہ اقبال نے تصوف کی تشکیل کے عوامل کی نشاندہی ان عنوانات کے تحت کی ہے۔

۱۔ اس زمانے کا سیاسی بے چینی کا زمانہ ہونا۔

۲۔ اسلامی عقلیت کے ارتیابی میلانات۔

۳۔ اسلام کے مختلف فرقوں کا خشک تقدس جو آزاد خیالی کا سخت دشمن تھا۔

۴۔ مختلف فرقوں کے نمائندوں کے مابین مذہبی مناظرے۔

۵۔ دورِ عباسیہ میں دولت کی روز افزوں فراوانی کے سبب اعلیٰ طبقوں میں مذہبی زندگی سے بے اعتنائی۔

۶۔ عیسائی راہبوں کی واقعی زندگی کا بعض اسلامی اولیاء کے اذہان پر بہت گہرا اثر ڈالنا۔

ان حقایق کی روشنی میں جہاں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تصوف سامی مذہب کے خلاف آریائی ردِ عمل کی پیداوار یا اشتراکیت ویدے جدید کی پیداوار نہیں، وہاں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ اصلی تصوف کا ماخذ خالص اسلامی تعلیم یعنی تصورِ زہد و تقویٰ ہے۔ اس مقام پر خالص اسلامی تصوف کو ایرانی تصوف سے ممیز کرنے کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ جس طرح قدیم ریشی پن سے بعد اسلام کی ریشیت کو ممیز کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ریشی پن کے برعکس ریشیت ایک باضابطہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

روحانی تحریک رہی ہے۔ جسکو ابھارنے کا سہرا براہِ راست اسلامی تعلیمات کے سر ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ریشیت کی تحریک بھی کشمیر میں اشاعتِ اسلام کے تقریباً ایک صدی گزر جانے کے بعد مقامی طور پر ویسے ہی عوامل کے باعث روبعمل آئی ہے، جن کی نشاندہی علامہ اقبال نے تصوف کے بارے میں کی ہے۔[1] اس کے برعکس ریشی پن کی قطعی نشاندہی ناممکن ہے مثلاً اسلامی ریشیت سے قبل اساطیری کردار کشپ ریشی کے عقایدو اعمال کی قطعی نشاندہی ہو ہی نہیں سکتی۔ اور کشپ ریشی کے بعد کشمیر میں گذرے ہوئے ہزاروں کے تمام مذہبی رہنماؤں کو ریشی قرار دینے کی اتنی گنجایش نہیں جتنی سمجھ کر بعض لوگ ناگوں کو کشمیر کے ابتدائی ریشی ناگ ارجن کو بدھ مت سے وابستہ ریشی اور سد بالو کو تنتر کے فلسفہ سے وابستہ ریشی قرار دینے لگے ہیں۔[2] حقیقت صرف اتنی ہے کہ ریشیوں کی روایت کے تحت کشمیریوں کے ذہن میں اسلام کی اشاعت سے پہلے بھی "ریشی" لفظ رائج تھا اور اس لفظ کے ساتھ اس وقت کے کشمیریوں کو بھی رعایتِ تقدس ملحوظ رہی ہے۔ لیکن اس تلفظ سے حسن ظن ہونے سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ ریشیت کی تحریک قدیم ریشی پن کا باضابطہ تسلسل یا احیا ہے چناں چہ اس صورت میں تحریک ریشیت کے باضابطہ بانی علمدارِ کشمیر شیخ نورالدین نندہ ریشی کو پہلا ریشی اساطیری کردار کشپ ریشی یا کسی ناگ قبیلے کے ریشی کو قرار دینا چاہیئے تھا نہ کہ احمد ریشی کو واقعہ یہ ہے کہ نندہ ریشی کو پہلی بار اجتماعی سطح پر جب ایک عرفانی اور اصلاحی تحریک منظم کرنے کی ضرورت لاحق ہوگئی تو آپ نے پہلی بار عوامی حسن ظن سے مملو "ریشی" لفظ کو نئی اور بالکل نئی جہتوں سے آشنا کر کے[3]

---

[1] یہ بات بہر حال ملحوظ رہنی چاہیئے کہ "ریشیت" لفظ کا استعمال پہلی بار کلام نندہ ریشی میں ہوا ہے۔ اور اس کے قبل ریشیت نام کے کسی روحانی مسلک یا تاریخ کا وجود کشمیر میں ہونے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔

[2] انہار۔ ج۔ ۲ ص ۱۸۔ [3] حاشیہ کی عبارت اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ریشیت کو مستقل تحریک کا درجہ دینے کا اقدام کیا۔ یہی اقدام وہ حدِ فاصل ہے جو اس مقدس موضوع کو تاویلات کا شکار ہونے سے بچاتی ہے بلکہ کشمیر کے تمام تذکرے اور تاریخیں اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہیں کہ اساطیری کرداروں سے قطع نظر کشمیر کے تمام معروف ریشیوں کا مسلک صوفیائے کرام کے مسلک سے نہایت قریب رہا ہے پھر یہ بھی ہے کہ صوفیائے کرام کی طرح یہاں کے ریشیانِ عظام نے عشقِ خدا و عشقِ رسولؐ میں والہانہ پن اختیار کرکے اپنی عبادات و ریاضات کو ان اصحاب صفہ کے اشعار سے ہم آہنگ کرنے کی باضابطہ بلکہ اجتہادی کوشش کی ہے۔ جن کو خود رسول اللہ صلعم نے بطور استثنیٰ ایسے شعار کی اجازت فرمائی تھی۔ بلکہ کشمیر کے ریشیوں کی کثیر تعداد صوفیائے چشتیہ اور صوفیائے نقشبندیہ کی طرح اویسی طریقے پر روحانی فیض پاتی رہی ہے۔[۱] اس لحاظ سے ریشیت کا یہ پہلو قاضی ناظم سیوہاروی صاحب کی کڑی تنقید کے باوجود اسلامی تصوف کی طرح اسی ایقان و عرفان کی روشنی میں معاملہ کو سمجھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ جسکے متعلق مولانا رومیؒ نے "کار پاکاں را قیاس از خود مگیر" کا مشورہ دیا ہے۔ کیونکہ جس طرح صوفیائے کرام کے ذکر و فکر کا جواز قرآن و سنت کے تزکیۂ نفس اور عہدِ نبوت کی غارنشینی سے پیش ہوتا ہے۔ اسی طرح ریشیانِ عظام کے فکر و ذکر کا جواز صوفیائے کرام سے ملتے جلتے اقدام و انہماک سے فراہم ہو جاتا ہے۔ بلکہ رسمی مباحث سے تھوڑا اوپر اٹھ کر اور

سے پروفیسر محی الدین حاجنی نے اس لفظ کی نئی جہتوں سے آشنا ہونے کے متعلق ایک معنی خیز بات یوں لکھی ہے ریشی لفظ نے کشیری زبان میں اپنا صحیح مقام تلاش کرتے کرتے معنی کا وہی لباس پہن لیا جو بقول ولیم میر عبرانی زبان کے "ارساں" لفظ نے پہن رکھا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ شخص جو اپنی نظافت و ذہانت کے کارن لوگوں میں بزرگ اور صوفی منش مان لیا جائے، ریشی کہلاتا ہے۔" مجلہ علمدار ۱ "

لے کشمیر کے مشہور عالم دین روحانی بزرگ اور شاعر بابا داؤد خاکی اس ضمن میں رقمطراز ہیں سے

ہر کہ را از غیب روحِ رہبری پیدا شود	او اویس باشد اندر اصطلاحِ ای خوش خصال
بود اویس این چنین بعضی شیوخ نقشبند	دیدہ ام این مکتوب در تصنیف شیخ خوش مقال
ریشیانِ این دیار اکثر اویسی بودہ اند	چشم عبرت بین شانرا بود از حق اکتحال

(ریشی نامہ المعروف قصیدۂ لامیہ ۔)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

قدیم ریشی پن سے ریشیت کو قطعی مختلف تحریک سمجھ کر دیکھا جائے تو واقعات کچھ نئے ہی انداز سے منکشف ہونے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں اپنے صاحب الرائے قارئین کی توجہ ایک ایسی دستاویز کی جانب مبذول کر دوں گا ــــ جو بعض قدیم تذکرے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں اس وقت ریشیت کے موضوع پر اہم ترین سند کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ دستاویز ریشی لفظ کے سنسکرت ماخذ اور اسکی دور از کار توجیہات میں الجھانے کے بجائے براہِ راست معروف ریشیانِ کشمیر کے حالات و واقعات بہم پہنچا کر ریشیت سے متعلق ٹھوس اور نئی سوچ ابھارتی ہے۔ معروف ریشیانِ کشمیر اور ریشیت سے متعلق یہ اہم ترین دستاویز بہ لا مدلل موجودہ ریشی نامہ یعنی ابوالفقراء بابا نصیب الدین غازی المعروف نصیب کشمیری کا "نور نامہ" ہے۔ بابا داوٗد خاکی جیسے روحانی بزرگ اور عالم دین کے خلیفۂ خاص بابا نصیب نے جہاں اپنے عملی اور علمی کارناموں میں ریشیانِ عظام اور صوفیائے کرام کے تبلیغی مشن کو آگے بڑھایا ہے وہاں آپ نے فکر انگیز بیانات دیکر صف اول کے ریشیوں کے احوال و آداب کی تفصیل پر مبنی مذکورہ اہم تذکرہ لکھ کر اس موضوع سے متعلق ہر طرح کی کج بحثی کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ چنانچہ اس اہم دستاویز کی تمہید میں ہی ایک بلیغ منظوم قطعے میں اور اس کے سیاق و سباق میں جو باتیں ریشیانِ کشمیر کے ٹھوس عقاید و اعمال سے متعلق دو ٹوک انداز میں ذہن نشین کرائی گئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ مشہور صوفیائے سلطان ابراہیم ادہم، بایزید بسطامی اور جنید بغدادی جیسے بزرگوں کے عرفانی مسلک کو جن لوگوں نے انتہائی لگن اور خلوص سے پرورش کی ہے۔ وہی لوگ کشمیر میں ریشی کہلاتے ہیں۔ ان ہی ریشیوں کا سربراہ وہ بزرگ ہے جو عشقِ محمدؐ میں سرشار ہو کر حضرت اویسؓ قرنی کا ثانی معلوم ہوتا ہے۔ ہم سب اسکو نورالدین نورانی کشمیری المعروف نندہ ریشی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۲۔ اپنے لئے ریشی نام اختیار کرنے والے ان بزرگوں کی بدولت ہی کشمیر میں شمع دین کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی ہے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

۳۔ ان ریشیوں نے تذبذب اور شک میں مبتلا لوگوں کی بہ یقین کیطرف راہنمائی کی ہے۔

۴۔ ریشیوں کی پاکیزگی اہل درد کے سارے دکھوں کا مداوا کرنے کی ضامن ہے۔

۵۔ ان ریشیوں کی بدولت کشمیر روحانی پیکروں کی جیتی جاگتی جنت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ریشیوں کے آستانوں سے لوگوں کو میتسر ہونے والے نور ہدایت نے کشمیر کو حقیقتاً حق شناسی کی جنت میں بدل کر رکھدیا ہے۔

۶۔ کشمیر کے قلعے کو ریشیوں کی بدولت ایسی مضبوطی ملی ہے کہ کوئی اس پر غلبہ نہیں پاسکتا۔

۷۔ ہمہ وقتی دردمندی کی متاع بے بہا کے مالک ہونے کے ناطے ہر دور کے انسانوں کو ریشیوں سے فیض پانے کی آرزو رہتی ہے۔

۸۔ ریشیت کے نمائندے فقط وہ لوگ تصوّر ہوں گے جنہوں نے خوفِ خدا اپنا اوڑھنا بچھونا بنا یا ہو اور جنہوں نے تقویٰ کا لباس زیبِ تن کرنے پر اکتفا کیا ہو۔

۹۔ جس طرح جادوگری کی پرکھ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے" اسی طرح ریشیت کی پرکھ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اصل ریشی وہ ہے جس کے گفتار اور کردار کی صفا دیکھ کر صوفیانِ باصفا کی یاد تازہ ہوتی ہو۔

۱۰۔ ریشیت کے تقاضے پورے کرنے والے لوگ وہ ہیں جو عبادت گذاری میں محو ہو کر دن کا کھانا اور رات کا آرام بھول جاتے ہیں گویا وہ عملاً صایم الدہر اور قایم الیل بن جاتے ہیں۔

۱۱۔ ریشیت کے اصلی علمبردار خود بھی اہلِ طریقت ہوتے ہیں اور دوسروں کو طریقت کی تربیت کے بھی وہ اہل ہوتے ہیں۔

۱۲۔ ریشیت کے علمبرداروں کو انتہائی خاکساری اور انکساری اختیار کرنی پڑتی ہے۔ کیوں کہ عاجزی میں ہی انکے علوِ مقام کا راز پنہاں ہوتا ہے۔

۱۳۔ جو سچے ریشی ہیں وہ معرفت کی شراب پینے کے بعد متوکلانہ زندگی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ وہ نفسِ امارہ اور بُری خواہشات سے دامن چھڑانے کے لئے زبردست ریاضت کرتے ہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

یہاں تک کہ ترکِ دُنیا سے بھی گریز نہیں کرتے۔

۱۴۔ مجھ جیسے شخص سے عظیم ریشیوں کے کارناموں کی نشاندہی ممکن نہیں۔ البتہ یہ جانتے ہوئے کہ ایسے اللہ والوں سے محبت رکھنے میں دنیا و عاقبت کی سرخروئی پانے کا راز مضمر ہے۔ اس لئے میں یہ "ریشی نامہ" لکھ کر اپنی محبت کا حق ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

۱۵۔ نصیب کشمیری کا پیشہ شاعری نہیں ہے۔ البتہ عظیم ریشیانِ کشمیر کی یادوں کو اپنا وِردِ زباں بنانے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

ان پندرہ بلیغ الفاظ میں ریشیت کا واضح منشور ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر اگر ریشیت کے اولین علمبردار حضرت نند ریشی کے کلام میں ملنے والے ریشیت سے متعلق واضح اشارے اور اولین دستیاب حوالہ یعنی ابوالفضل کے اقتباس کو مندرجہ بالا پندرہ نکات کے متن پر منطبق کر کے دیکھا جائے تو خالص اسلامی تصوف سے ملتے جلتے ریشیت کے خدوخال اپنے پورے جمال و جلال کے ساتھ ابھرنا شروع ہو جائیں گے۔ مثلاً

استنتاج: ۱۔ قبل اسلامی دور کا "ریشی" لوگوں میں صرف اس بات کے لئے قابلِ احترام تھا کہ وہ عملی زندگی سے کنارہ کش ہو کر اور پکا راہب اور مرد مرتاض بن کر بے ضرر HARMLESS ہونے کی منزل اسی طرح کی کڑی ریاضت سے طے کرتا تھا۔ جس طرح اس برف پوش خطے کا سانپ یہاں کی خنک آب و ہوا اور نرم مٹی کی چپکیوں پر گذارہ کرنے کے سبب زہر سے دستبردار ہو کر بے ضرر بن جانے کی منازل طے کرتا ہے۔ اس کے برعکس تبلیغ اسلام کے بعد سماجی سطح پر قدیم ریشی لفظ سے دانشورانہ استفادہ کر کے عوام کے عامیانہ اور جاہلانہ طرح کے ملے جلے عقائد کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا اجتماعی کام مقامی دانشور طبقہ انجام دیتا ہے، گویا قدیم ریشی لفظ سے وابستہ عقیدت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کشمیر کے مقامی مبلغوں نے اپنے لئے ریشی نام پسند کیا اور وہ خدمت اسلام کر دکھائی جو جذبے غیر کشمیری مبلغوں سے ممکن نہ تھی۔ اس طرح اب ایک فرد کی ریاضت صرف فرد کے لئے اہم نہیں رہ گئی بلکہ سرورِ کائناتؐ کی ابتدائی چہل سالہ ریاضت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پر مبنی زندگی یعنی اسوۂ حسنہ کی پیروی میں سے

مدتی اندر حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

کے مصداق کشمیر کے ریشیانِ با صفا حضرت نندہ ریشی کے نقش قدم پر چل کر اور ایک تمدن ساز تحریک سے وابستہ ہو کر قدیم طرح کے ریشیوں کی منازل ریاضت سے آگے بڑھ گئے اور اپنے عزائم کو ایک طبعی مشن کی صورت دے کر نئے مسلک ریشیت کی تشکیل کرنے میں کامیاب ہو گئے اس نکتے کو سمجھنے والا ہر ذہین قاری اس بات سے اتفاق کرے گا کہ قدیم ادب ریاضت کا ریکارڈ توڑنے کا اقدام اصل میں ریشی پن سے ریشیت کو ممیز کرنے کا اقدام تھا۔ کیونکہ اب ریشیت کشمیر میں تصوف اور تبلیغ اسلامی کے ایک ٹھوس مقامی رنگ اختیار کرنے کا دوسرا نام بن گیا تھا۔

۲، ریشیت کا یہ ٹھوس پہلو صرف وہ لوگ دانستہ یا نادانستہ طور پر نظر انداز کرتے ہیں جو ریشیت کے بانی اور عظیم ترین ریشی یعنی نندہ ریشی کے ان بیانات سے آنکھیں چراتے ہوئے حقیقی ریشیوں سے جعل ساز ریشیوں کو یعنی کشمیر کے حقیقی صوفیوں سے نقلی صوفیوں کو الگ کرنے کی تاب یا توفیق نہیں رکھتے مثلاً۔ نندہ ریشی کے یہ بیانات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) رٔیشو ہے رٔیشنٔت یا ہن
گوپھن چھلہٕ ہن اُشہٕ ستی
رٔیشی چھنہٕ رٔیشٔت پالن
پان چھی گالن پرٕشہٕ ستی

اے کاش مکر و فریب برتنے والے ریشی حقیقی ریشیت کے تقاضے پورا کرنے کی توفیق پاتے تب یہ لوگ اپنی ریاضت کے غاروں کو شرمندگی کے آنسوؤں سے دھونا سیکھ لیتے یہ نقلی ریشی ریشیت کے تقاضوں سے بے بہرہ ہیں انکی ریاضت صرف دکھاوا دکھی اور خلق فریبی کے لئے ہے انکی ریاضت میں کوئی خلوص نہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کلکی ریشی، کینٹھ ریشی

ژمن کھینس گنُے غم

کھاسہ زٕ تھون نیشم نیشی

اکس گگل تہٕ بئیس کرٕم

تہٕ کھیتھ یمن خوداسے مشن

ریشہ ہے یم تہٕ پیٹھ ژور کم

یعنی: "یہ اپنے سروں پر ریشی پن کا سہرا سجانے والے دراصل ریشی نام بیچنے والے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو ریشی پن کی آڑ میں لذائذِ دنیا سے ہمکنار ہونے کی دھن لگی رہتی ہے ان کی کوشش یہ رہتی ہے کہ کس طرح خاص فرقوں کو آپس میں دست وگریباں اور مشغول فتنہ رکھیں۔ یہ لوگ کبھی ایک کو ایک طرح اور دوسرے کو دوسری طرح لوٹتے ہیں۔ اس طرح کے استحصالی کاروبار میں انہیں خدا کی یاد کب آتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اگر انہیں ریشی کہیں تو چور اور لٹیرے کون ہوں گے۔"

ان الفاظ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی دور شروع ہو جانے کے بعد بھی ریشی پن کے نام پر لوگوں کی سادہ لوحی کا استحصال کرنے والا ایک فریب کار گروہ موجود تھا اور حضرت نندہ ریشی سے قبل گذرے ہوئے عظیم چھ ریشیوں کے ہم عصروں میں بھی ایسے لوگوں کا وجود رہا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح صوفیاء کے دوش بدوش جعلی صوفیا وجود رکھتے تھے۔ اپنے سے قبل گذرے ہوئے چھ نمائندہ قسم کے عظیم ریشیوں کے نام علمدار کشمیر نے اپنے مشہور بند میں یوں بیان کیے ہیں۔

اوٗل ریشی احمد ریشی دوٗیم حضرت اویس آو

ترییم ریشی زُلکا ریشی ژوٗریم حضرت پلاس آو

پوٗنژیم ریشی رُمہٕ ریشی شیٖیم حضرت میران آو

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ستی مس کوٗر ہمہ وشناہشی بہ کُس ریٗشی ئے کیاہ ناو

پہلا عظیم ریشی یہاں احمد نام کا گزرا ہے۔ جب کہ دوسرے کا نام اویس ریشی تھا۔ تیسرے عظیم ریشی کا نام زلکا اور چوتھے کا نام پلاس رہا ہے پانچویں نمائندہ ریشی کا نام رُمہ ریشی ہے اور چھٹا میران ریشی۔ البتہ ساتویں نمبر کی نوبت مجھ ناچیز پر پہنچی۔ کہاں یہ ذمہ داری اور کہاں ہیں ؟ -

ایک اندازہ کے مطابق پہلا ریشی "احمد" ہونے کا مفہوم پیغمبر اسلام لیا جاتا ہے۔ دوسرے اندازے کے مطابق احمد ریشی بابا بلبل شاہ ترکستانی کے ہمعصر مولانا احمد جیسے کوئی اولین مبلغ ہیں۔ جو وادی کشمیر میں سب سے پہلے داخل ہو کر از روے حدیث دین دوسروں پر سبقت لے گئے ہیں۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ بابا بلبل شاہ کے ہمعصر مولانا احمد کو تاریخ کبیر کشمیر کے مصنف نے مولانا احمد علامہ سمجھنے کے ناطے بابا بلبل کا مرشد قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے شعر میں بیان کیا گیا واقعہ احمد ریشی کے عوام میں وہ کام انجام دینے سے تعلق رکھتا ہے۔ جو ایک غیر زبان (فارسی) میں دین اسلام کی تبلیغ کرنے والے بہت سے سادات پر اثر آفرینی میں سبقت لے گئے تھے۔ شعر پر دیگر تاریخی حقایق منطبق کر کے دیکھئے تو ریشیت کے پہلے موڑ سے ساتویں موڑ تک یعنی ریشیت کے علمدار سندہ ریشی تسلیم کئے جانے کے وقت تک ان صوفیان با صفا اور ریشیان ایزد پرست کے متوازی ریاکار ریشیوں کا وجود پایا جاتا تھا۔ لیکن وہ ریشیت سے وابستہ نہ تھے۔ محض ریشی نام کا استحصال کرنے والے تھے۔ جبھی تو سندہ ریشی کو اپنے پیشرو چھ نمائندہ ریشیوں کی یاد اور ان کے صالح رفتار کی یاد چند ہمعصر مکاروں کو دیکھ کر اس طرح تڑپاتی تھی کہ ؎

ریٗشو آسی پُتسم ریٗشی رِتمن اوس بیٚٹھ جنٛد ننگہٕ تن
مُنگِتہ کھیاوہٕن وُشہٕ کٔشی ہتھ سٕرہٕن تہٕ پتھ وَنن ئے

پِتہ مبو ریٗشو دوہ دہن رُچھی نسٛپن وَرکھ کھٔنی راتھ
کیٚنژھ ریٗشی سٕر پھ تہٕ ژٕچھی نفر بابہٕ توٕ کھوتہٕ اَنہٕ کیٚشا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ان معنی خیز اشارات کی روشنی میں ریشیت کا مفہوم کافی واضح ہو جاتا ہے۔ اور ابوالفضل کی اطلاعات کا یہ متن بھی اس میں صراحت کا کام دیتا ہے کہ :

"کشمیر کے سب سے زیادہ قابل تعظیم لوگ ریشی ہیں اگرچہ یہ مذہبی ظاہر داری میں گرفتار نہیں ہیں۔ پھر بھی یہ لوگ خدا کے سچے خادم ہیں۔ یہ کسی فرقے کے خلاف تنفر نہیں رکھتے۔ یہ راستوں کے کنارے شجر کاری کر کے رفاہ عام کا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ گوشت کھاتے ہیں اور نہ بیاہ کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اس وقت ریشیوں کی تعداد کشمیر میں دو ہزار ہے۔"[1]

ابوالفضل نے جس زمانے میں یہ بات لکھی ہے۔ اس زمانے تک حضرت نندہ ریشی کے خلفاء اور مریدوں کے اثر سے ریشیت کشمیر میں ملک گیر ساکھ بنا چکی تھی۔ بلکہ ان کے طریق ریاضت اور بے ریا تبلیغی مشن میں ان تمام صوفیانہ عقاید و اعمال کی جھلک دیکھنے میں آتی تھی۔ جو اس سلسلے میں قلمبند کئے گئے ہیں کہ صوفی کون ہے مثلاً۔

ا ، ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ لوگ چوں کہ پٹو کا بنا ہوا نزدہ "صوف" پہنتے تھے اس لئے صوفی کہلاتے تھے۔ بعض کے نزدیک صوفی کا ماخذ صف اول ہے۔ بعض لوگ اصحاب صفہ کی عادتیں عزیز ہونے کے ناطے انہیں صوفی نام سے موسوم کئے جانے کے قائل ہیں۔ ایک جماعت صوفی لفظ کو صفا کا مشتق سمجھتی ہے۔ لیکن حقیقت ان میں کسی کی تائید نہیں کرتی (حضرت شیخ سراج)

ب ، جس کا دل صفا سے بریز اور کدورت سے پاک ہو صوفی وہی ہے (حضرت داتا گنج بخش لاہوری)

ج ، صوفی وہ ہے جو اپنے نفس سے فانی ہو کر حق میں زندہ و باقی ہو اور مادیت سے گذر کر حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا ہو (داتا گنج بخش)

د ، صوفی وہ ہے کہ جب وہ گفتار میں آتا ہے تو اس کی زبان حقایق کی ترجمان ہوتی ہے اور جب وہ خاموش ہوتا ہے تو اس کے اعضا قطع علایق پر زبان حال سے شہادت دیتے

---

[1] مردم شماری کے "اکادمی" میں شایع کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق کشمیر میں نسلی طور پر ریشی کہلانے والوں کی تعداد اس وقت بیس ہزار کے قریب ہے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

رہتے ہیں۔ (حضرت ذوالنون مصری)

ھ ، صوفی کا مسلک یا تصرف وہ ہے جس میں بندہ کی اقامت کی گئی ہے (حضرت جنید بغدادی)

د ، صوفی کا مسلک عام خطوط نفسانی کے ترک کا نام ہے (حضرت ابوالحسن نوری)

ر ، صوفی وہ لوگ ہیں جن کی روحیں آلائیشوں سے پاک ہو چکی ہیں۔ اور وہ رب العزت کے حضور میں صف اول میں حاضر ہیں۔

ایک صوفی کے تعارف میں پیش کئے گئے ان حقائق کو سامنے رکھ کر حقیقی ریشیوں کے تعارف میں لکھے گئے مختلف منظوم تذکروں کے اشعار دیکھئے تو کشمیر میں رائج ریشی لفظ صوفی لفظ کا نعم البدل محسوس ہونے لگے گا۔ اختصار کے ساتھ اس طرح کا اطلاق رکھنے والے چند شعر خواجہ بہاؤالدین متو کے ریشی نامہ سے پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ریشیان نور مطلق اند ہمہ　　خاصۂ حضرت حق اند ہمہ
ہمہ شاہانِ ملکِ تجرید ند　　ہمہ مستانِ جامِ توحید ند
در بنِ غار ہا بتاریکی　　کردہ بانورِ ذات نزدیکی
ہمہ از خانمان نفور شدہ　　ہمہ از خورد و خواب دور شدہ
خورد ایشان گیاہ تلخ یلاق　　خواب شان در شہود و استغراق
کس بایں کار و ایں عمل نرسد　　کس بایں طور و ایں محل نرسد
پای تا فرق عین نور ہمہ　　عین جمعیت حضور ہمہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

شریف حسین قاسمی

نویں صدی میں کشمیر کی ایک جھلک

کشمیر ان ایرانی سیاحوں، شاعروں، عالموں اور تاجروں کے لئے جنت نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو قدیم زمانے سے ہندوستان آتے رہے ہیں۔ یہاں کی سرسبز و شاداب وادیوں اور گنگناتے جھرنوں نے ان ایرانی لوگوں کے دلوں کو ہمیشہ لبھایا ہے۔ انہیں کشمیر کی فضاؤں میں اپنے وطن کی بو آتی ہے۔ ایرانیوں نے اپنی تحریروں میں کشمیر کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ جس سے اس خطۂ سرزمین سے ان کے قلبی لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ ایرانی شعراء نے تو کشمیر کی تعریف میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ شاہجہان کے زمانے میں ایرانی شعراء کی بڑی تعداد، دربار سے مستعفی ہونے کے بعد کشمیر منتقل ہوئی اور کشمیر کو ایک ایسا گوشۂ عافیت پایا۔ جہاں انہوں نے حسین اور دلکش قدرتی مناظر کی آغوش میں زندگی کے آخری دن گزارے اور آخر کار اسی سرزمین کا حصہ بن گئے۔

ناخدا بزرگ شہریار رامہرمزی نے اپنی کتاب "عجائب ہند" میں کشمیر سے متعلق چند واقعات بیان کئے ہیں۔ ذیل میں انہی واقعات کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "عجائب ہند" اور اس کے مصنف کے بارے میں اختصار سے عرض کر دیا جائے۔

"عجائب ہند" اواخر دسویں صدی عیسوی کی تالیف ہے۔ یہ عربی زبان میں ہے[1] جس کا فارسی ترجمہ، ایران سے شائع ہو چکا ہے[2]۔ یہ کتاب ایک سو چھتیس معلوماتی خاکوں پر مشتمل ہے جنہیں نویں صدی عیسوی میں خلیج فارس سے چین تک بحری سفر کرنے والے جہاز کے کپتانوں اور سمندری تاجروں (ان میں ایرانی بھی تھے، ہندوستانی اور عرب بھی) نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدا

حاشیہ کی عبارت اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کے بعد بزرگ بن شہریار سے جو بصرہ کا ایک بڑا تاجر تھا، بیان کئے تھے۔

شہریار اپنی اس کتاب میں اس زمانے کے اس عقیدہ کا اظہار کرتا ہے کہ خدا نے دنیا کے عجائبات کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہے ان میں نو حصے دنیائے مشرق کی قسمت میں آئے ہیں۔ اور ایک حصہ مغربی، شمالی اور جنوبی دنیا کو عطا کیا گیا ہے۔ اور عجائبات عالم کے وہ نو حصے جو مشرق کو عطا کئے گئے ہیں ان میں سے آٹھ حصے ہندوستان اور چین کی سرزمین میں محفوظ ہیں۔

شہریار نے اپنی کتاب کے آغاز ہی میں کشمیر سے متعلق ایک حکایت بیان کی ہے۔ جو ملک را[1] (راہرا کی تخفیف) کے خفیہ طور پر اسلام لانے سے متعلق ہے۔ اس حکایت کا خلاصہ درج ذیل ہے:

ابو محمد حسن بن عمرو بن حمویہ بن حرام بن حمویہ النجیرمی نے بصرہ میں مجھ سے بیان کیا کہ وہ ۲۸۸ھ/۹۰۰ء میں منصورہ (سندھ) میں مقیم تھا (اس زمانے میں سندھ پر عربوں کی حکومت تھی) وہاں کے ایک معتبر شیخ نے بتایا کہ شاہ رائق کے لڑکے مہروک نے جسکی حکومت کشمیر بالا اور کشمیر زیریں (دکن پلیٹو) کے درمیان واقع ہے، ۲۷۰ھ/۸۸۳ء میں منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کو ایک خط لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کے لئے، ہندی زبان میں[4]، شریعت اسلام کے اصول و ضوابط کی وضاحت اور تشریح کا انتظام کرے۔ عبداللہ نے منصورہ کے ایک دانشمند شخص کو بلایا جو شاعر بھی تھا۔ یہ شخص الاصل عراقی تھا۔ اس کی پرورش ہندوستان میں ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے ہندوستان کی مختلف زبانوں سے یہ شخص واقف تھا۔ منصورہ کے حاکم نے اس شخص کو ہندوستان کے بادشاہ کی خواہش سے مطلع کیا اور اس سے درخواست کی کہ یہ کام انجام دے۔

اس شخص نے ایک نظم میں ہندوستانی بادشاہ کی درخواست کے مطابق، اسلام کی وضاحت کی اور

---

[1] ۔ یہ عربی کتاب، لائڈن سے ۱۸۸۶ء میں شایع ہوئی۔ پروفیسر خورشید احمد فارق، شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی نے بھی اپنی کتاب "عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان" میں عجائب ہند سے اقتباسات پیش کئے ہیں۔

[2] ۔ "عجائب ہند" تالیف ناخدا بزرگ شہریار رامہرمزی، ترجمہ: محمد ملک زادہ، مطبوعہ بنیاد فرہنگ ایران۔

[3] ۔ اس راجہ سے راشٹراکوٹا تاجدار کوشنا دوم مراد ہے جس نے ۸۷۰ء سے ۹۱۵ء تک اڑتیس سال حکومت کی۔

[4] ۔ یہاں ہندی زبان سے راجگان راشٹرکوٹا کی علاقائی زبان مراد ہے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نظم راجہ کو بھیج دی۔ جب یہ منظومہ راجہ کے سامنے پڑھا گیا تو راجہ نے اسے بہت پسند کیا اور حاکم منصورہ، عبداللہ کو لکھ بھیجا کہ صاحب نظم کو اس کے دربار میں روانہ کردے۔ حاکم منصورہ نے اس شاعر عالم کو ہندوستان بھیج دیا اور وہ یہاں تین سال مقیم رہا اور اس کے بعد منصورہ لوٹا۔

حاکم منصورہ نے الور کے راجہ کے قیام کے حالات اس سے دریافت کئے۔ صاحب نظم نے بتایا کہ:- جب میں واپس ہوا تو ہندوستانی راجہ قلب و زبان سے مسلمان ہو چکا تھا۔ لیکن اس خوف سے کہ اگر اس نے تبدیلی مذہب کا اعلان کردیا تو ممکن ہے اپنی سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑیں، اس وجہ سے وہ خاموشی سے اسلام کا پیروکار ہوگیا۔ ایک دن راجہ نے خواہش ظاہر کی کہ قرآن کریم کی تفسیر ہندی زبان میں بیان کی جائے۔ اس کی خواہش کے مطابق میں نے قرآن کریم کی تفسیر ہندی میں شروع کی۔ جب میں سورہ یٰسین پر پہنچا تو اس آیت "قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ"[1] کی تفسیر بیان کی۔ بادشاہ نے جو قیمتی لعل و جواہر سے آراستہ زریں تخت پر رونق افروز تھا، کہا: اس آیت کے معنی پھر سے بیان کرو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ بادشاہ تفسیر سن کر تخت سے نیچے اتر آیا۔ اور سجدہ میں گر گیا۔ اور اس قدر رویا کہ اس کا چہرہ خاک آلود ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور میری طرف رخ کرکے بولا: یہی ہے سب سے پہلا معبود اور ازلی رب، یکتا بے مثال اور عبادت کے قابل۔ اس واقعہ کے بعد اس نے اپنے لئے الگ ایک محل تعمیر کرایا اور اس میں تنہا وقت گذارتا۔ ظاہری طور پر وہ کہتا تھا کہ امور سلطنت کو سلجھانے کے لئے وہ اس محل میں تنہائی میں غور و فکر کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس تنہائی اور خلوت میں خدا کی عبادت کرتا تھا۔ نماز ادا کرتا تھا۔ کوئی دوسرا اس کے فعل سے آگاہ نہ تھا۔ اس راجہ نے مجھے تین بار میں چھ سو من[2] سونا (اس زمانے میں ایک من تیرہ چھٹانگ کے برابر تھا) عطا کیا۔

---

[1] - ترجمۂ آیت: مخالفین کہتے ہیں، کون زندہ کرے گا ان ہڈیوں کو جب کہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ جواب دیجئے ان کو کہ وہی اللہ پیدا کریگا جس نے پہلی بار پیدا کیا اور وہ ہر پیدائش کو جانتا ہے۔

[2] - عرب من کو رطل کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ رطل کا وزن اس زمانے میں بقول مقدسی سندھ اور ہند میں ارطل مکہ کے برابر تھا یعنی تقریباً تیرہ چھٹانگ (احسن التقاسیم، لائڈن، ص ۴۸۲)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اسی عالم دین شاعر نے کشمیر کے ایک واعظ سے متعلق ایک اور حکایت بھی بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کشمیر بالا کے رہنے والے، ہر سال ایک جشن مناتے ہیں۔ اس روز، لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ایک خطیب، وعظ و نصیحت کیلئے منبر پر آتا ہے۔ ایک بار یہ خطیب، حسب معمول وعظ کہنے آیا اور اپنے ہمراہ، مٹی کا ایک کچا گھڑا بھی لیتا گیا۔ منبر سے اس نے لوگوں کو خطاب کیا :

" اے لوگو! اپنے نفس کے مالک بنو، اس کے تابع نہ ہو، اور جہاں تک ہو سکے، اپنے مال و متاع کی حفاظت کرو "

اس کے بعد اس نے مٹی کا کچا گھڑا لوگوں کو دکھایا اور کہا کہ اس مٹکے کو دیکھو۔ چونکہ اسکی کی حفاظت کی گئی ہے، اس کو سلیقے اور احتیاط سے رکھا گیا ہے، اس وجہ سے چار ہزار سال گذرنے کے باوجود، یہ اپنی اصلی حالت میں باقی ہے۔

حسن بن عمرو نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ منصورہ میں کشمیر پائین کے لوگوں سے ملا ہے۔ کشمیر اور منصورہ کے درمیان، خشکی کے راستے، ستر دن کی مسافت ہے۔ لیکن دریائے مہران[1] کے راستے جس کی روانی، طوفان کے زمانے میں دجلہ و فرات کی روانی کی مانند ہے، یہ کشمیری قسط[2] سے بھرے بوروں کے ذریعہ منصورہ تک کا سفر کرتے ہیں۔ حسن کا کہنا ہے کہ ہر بورے میں سات سو آٹھ سو من قسط بھری ہوتی ہے۔ ان بوروں پر کھال منڈھ دی جاتی ہے۔ بوروں میں پانی نہ داخل ہو جائے اس لئے ان کو، کھال سے منڈھنے کے بعد، تارکول سے لیپ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بوروں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر، مضبوطی سے باہم باندھ دیا جاتا ہے۔ ان پر کشمیری بیٹھ جاتے ہیں اور دریا کا سفر، منصورہ تک، اسی طرح طے کیا جاتا ہے۔ اس طرح قسط سے بھرے یہ بورے، پانی سے محفوظ، چالیس دن میں کشمیر سے منصورہ پہنچ جاتے ہیں۔

ایک دوسری حکایت کے مطابق، ایک ملاح نے جو طویل مدت تک ہندوستان اور قرب جوار کے علاقوں کا سفر کرتا رہا تھا، شہریار، مصنف عجائب ہند سے ایک دلچسپ اور عجیب و غریب

---

[1] - بلوچستان اور ہندوستان کے درمیان واقع ایک دریا کا نام تھا۔
[2] - ایک قسم کی تلخ لکڑی کی طرح کی دوا کا نام جس کو ہندی میں کُٹ کہتے ہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

داستان بیان کی۔ اس ملاح نے یہ واقعہ ان لوگوں سے سنا تھا جو ہندوستان میں رہ چکے تھے۔ ملاح کی اس داستان کے مطابق :

کشمیر بالا کے علاقے میں، ایک جگہ، جسے ترنارین (شمال میں ایک علاقہ) کہتے ہیں اور جہاں متعدد باغات ہیں، جہاں بہت سی نہریں بہتی ہیں، ایک بازار واقع ہے۔ یہ بازار، بازار اجنہ (جن کی جمع) کے نام سے موسوم ہے۔ اس بازار میں خرید و فروخت کی دھا چوکڑی، گاہک اور دوکاندار کے درمیان ہونے والی گفتگو اور تکرار کا شور سنائی دیتا ہے لیکن کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ یہ جگہ قدیم زمانے سے مشہور ہے۔ ملاح سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے یہ معلوم نہیں کہ آیا یہ بازار اس وقت تک موجود تھا یا نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور حکایت سے کشمیر میں ہیرے پائے جانے کا علم ہوتا ہے :

ایک شخص نے جو ہندوستان بہت آیا گیا تھا اور یہاں طویل سفر کئے ہیں۔ شہر کو بتایا کہ کشمیر کے نواح میں بیش قیمت، صاف اور بے نظیر ہیرے دستیاب ہوتے ہیں۔ جہاں یہ ہیرے پائے جاتے ہیں وہ جگہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک تنگ درّہ ہے جہاں ہر موسم میں، سردی ہو یا گرمی اور ہر وقت، دن ہو یا رات، آگ کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں۔ اسی جگہ ہیرے پائے جاتے ہیں۔ ان ہیروں کو حاصل کرنے والے لوگ، پائین کشمیر کے ایک مخصوص طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ہیرے حاصل کرنے اس جگہ آتے ہیں۔ ہیرے حاصل کرنے کے لئے، اس طبقے کے کچھ لوگ جمع ہو کر اس درہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ درہ کے قریب پہنچ کر یہ لوگ ایک بھیڑ کاٹتے ہیں اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد، ان ٹکڑوں کو ایک ایک کرکے منجنیق سے اس تنگ درہ میں پھینکتے ہیں۔ اس درہ میں داخل ہونا چند وجوہات کی بنا پر، جان جوکھوں کا کام ہے۔ مثلاً خود آگ کی تپش وہاں جانے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کے علاوہ، بڑے بڑے سانپ اور موذی اژدھے اس آگ کے چاروں طرف کنڈلی مارے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور وہاں سے کسی انسان کے گذرنے کو ناممکن بنائے ہوتے ہیں۔ جب مذکورہ بالا لوگوں کا گروہ، گوشت کے ٹکڑوں کو درہ میں پھینکتا ہے تو ان میں سے کچھ زمین پر گرتے ہیں اور کچھ آگ میں جا پڑتے ہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

زمین پر گرنے والے گوشت کے ٹکڑوں کو حاصل کرنے کے لئے کچھ گدھ جو وہاں منڈلاتے رہتے ہیں، ان پر جھپٹتے ہیں اور انہیں اٹھالے جاتے ہیں۔ جو گدھ زمین پر بڑے گوشت کے ٹکڑوں کو اٹھالے جاتے ہیں۔ لوگ ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور گدھ جس جگہ بیٹھ کر گوشت کے ٹکڑے کھاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ہیروں کے وہ ٹکڑے اٹھا لیتے ہیں جو گوشت سے چپک کر وہاں تک پہنچتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ گدھ آگ کے نزدیک پڑے گوشت کے ٹکڑوں کو اٹھانے کی کوشش میں خود بھی جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ گدھ گوشت کے ٹکڑوں کو زمین پر گرنے سے پہلے ہی جھپٹ لیتے ہیں۔

کشمیر سے متعلق یہ چند اور ہندوستان کے بارے میں دوسری حکایتیں جو عجائب ہند میں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے کچھ ممکن ہے عقل کی کسوٹی پر پوری نہ اتریں لیکن ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو اس زمانے میں ایک ایسا عجائب گھر سمجھا جاتا تھا، جہاں کے چپے چپے پر قدرت کی صنعت کاری کے نمونے دیکھنے والوں کو محو حیرت کر دیتے تھے۔ اور خود ہندوستانیوں کی عقل و فہم اور انکی دانشمندی کے واقعات دوسرے لوگوں کے لئے سبق آموز ہوتے تھے۔

O

شیرازہ
میں چھپنے والی نگارشات

۱۔ ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔

۲۔ ہندوستانی تاریخ و تمدن اور ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری و تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔

۳۔ ریاست کے تمدنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔

۴۔ فن تعمیر آرٹ اور مصوری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔

۵۔ منظومات، بشرطیکہ معیاری ہوں، قبول کی جاتی ہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

محمد رضی الدین معظم

شوپنہار اور اس کا فلسفہ

آرتھر شوپنہار کی نسبت یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ وہ اپنی صدی کا سب سے بڑا صاحب فکر تھا اور اس کا فلسفہ اس قدر مقبول ہر خاص و عام ہوا کہ لوگ اس کو بجائے فلسفی سمجھنے کے ادیب اور شاعر سمجھنے لگے۔ لیکن فلسفہ کے اساسی اور بنیادی مسائل میں جو دسترس اسکو حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے کو نہ حاصل ہو سکی۔ نظریہ علم النسانی، سر کائنات اور حسن و خیر کی ماہیت کے متعلق جو اچھوتے خیالات وہ چھوڑ گیا ہے وہ اس کی اپنی طباعی اور خلاقی کا نتیجہ ہیں اور اس کو لافانی بنانے کیلئے کافی ہیں۔

شوپنہار ۲۲ر فروری ۱۷۸۸ء کو جرمنی میں بمقام ڈینزگ پیدا ہوا۔ اسکا باپ ہنرش فلورش شوپنہار متمول اور باوقار تاجر شمار کیا جاتا تھا اور ماں یوحنا شوپنہار ناول نویس کی حیثیت سے ممتاز تھی۔ باپ بیٹے کو تجارت میں لگانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے شوپنہار کو تاجرانہ زندگی کیلئے تیار کرنا شروع کیا اور شوپنہار کو ۱۷۹۷ء میں فرانس بھیجا۔ وہ وہاں فرانسیسی زبان کا ماہر بن گیا۔ ۱۷۹۹ء کو جرمنی واپس آیا تو جرمن زبان قریب قریب بھول گیا تھا۔ فرانسیسی مادری زبان ہو کر رہ گئی تھی پھر ۱۸۰۳ء میں انگلستان، فرانس، سوئزرلینڈ اور آسٹریا کا دورہ کیا اور اس دوران انگریزی پر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

قدرت حاصل کر لی ۱۸۰۵ء میں باپ کا انتقال ہوگیا تو شوپنہار نے کچھ دنوں تک پوری کوشش کی کہ تجارتی زندگی سے دلچسپی ہوجائے اور باپ کی خواہش پوری ہو لیکن ساری کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں۔ ۱۸۰۷ء میں ادبیات قدیمہ کے پڑھنے کا شوق ہوا تو ۱۸۰۹ء میں گٹنجن یونیورسٹی میں ادبیات کے مطالعہ کی غرض سے داخل ہوا۔ ۱۸۱۱ء میں فلسفہ کی طرف رجحان ہوا اور ۱۸۱۳ء میں گٹنجن یونیورسٹی سے فلسفہ میں ڈاکٹری کی ڈگری ملی۔

شوپنہار اپنے دماغ کو کبھی بیکار نہیں رکھتا تھا اور غور و تامل کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہونے دیتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی ادبی قوت روز افزوں ترقی کرتی گئی۔ برلن میں پروفیسر کی حیثیت سے کار گذار رہ کر ۱۸۳۱ء میں فرانکفرٹ چلا گیا اور ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء میں تمام عمر تجربہ میں بسر کر کے اس دنیا سے چل بسا۔

شوپنہار کے فلسفہ کی ایک خاص کڑی جمالیات Aesthetics سے ہے جمالیات فلسفہ کی وہ شاخ ہے جو حسن اور فنون لطیفہ سے متعلق ہوتی ہے شوپنہار کا خیال تھا کہ اگر آج دنیا میں حسن و عشق، فنون لطیفہ اور مذہب کا وجود نہ ہوتا تو پھر ہمارے پاس کوئی ایسا دارو نہ تھا جس سے زندگی کی المناکیاں اور زمانہ کی تلخیاں گھٹائی جاسکتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ زندگی بلاؤں اور مصیبتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ قدرت کے کارخانے میں جدھر نظر اٹھا کر دیکھئے دوا دوش کا ایک طوفان برپا ہے۔ ہر طرف نفسی نفسی ہے کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی غرض کی چال چلتا ہے گویا زندگی ایک کارزار ہے جسمیں کل مخلوقات سرگرمی کے ساتھ شریک ہے اور پھر اس تمام کارزار کا نتیجہ وہی ناکامی اور کف افسوس ملنا ہے۔ بعض دفعہ ہمارا یہ احساس ہم پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ ہم سراسیمہ ہو کر چلا اٹھتے ہیں ؎

آنکھیں جدھر اٹھایئے اک حشر زار ہے لے آئی کس دیار میں عمر رواں مجھے

لیکن ہم اس مصیبت وجد وجہد کی قیامت سے نجات بھی پاسکتے ہیں تو اسکی صورت دھیان اور گیان ہے یا شاعرانہ محویت اور جمال پرستی۔ شوپنہار نے اسی لئے علم اور فنون لطیفہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کو بڑی اہمیت دی ہے یہ شاعرانہ محویت جو تمام فنونِ لطیفہ میں یکساں ضروری ہے' ہم کو
دنیا کے افکار و آلام سے چھٹکارا دلانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہم لاکھ آزردہ اور
دلگیر ہوں' لاکھ زندگی کی ناہمواریوں نے بے دم کر رکھا ہو' ہماری زندگی عذاب بن گئی ہو لیکن
جس وقت کوئی دلکش تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے یا کوئی لطیف شعر یاد آجاتا ہے تو ہم کم از کم
وقتی طور پر اپنی محرومی و تلخی کو بھول جاتے ہیں۔ اور ہمارے دل میں ایک روح پرور کیفیت محسوس
ہوتی ہے' چاہے اس سے تصویر یا شعر کا موضوع بجائے خود کتنا ہی درد انگیز کیوں نہ ہو۔ شوپنہار کہتا
ہے کہ فنون لطیفہ کا کام زندگی کی اصلیت نہیں تو کم از کم اسکی ہئیت کو بدل دینا ہے۔ زندگی کا
راز اظہار میں ہے اظہار میں آجانے کے بعد ہر چیز کے اندر ایک نئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔
زندگی درحقیقت نام ہے موت سے پہلو بچا بچا کر بھاگتے رہنے کا۔ ہماری ہر سانس ایک جنگ
ہوتی ہے۔ موت سے جو لمحہ بہ لمحہ ہمکو اپنی خوفناک دھمکی دیتی رہتی ہے۔ بے وقوف انسان یہ سمجھتا ہے
کہ وہ اس طرح موت سے بچ کر نکل جائے گا حالانکہ موت کی جیت یقینی ہے جس گھڑی انسان پیدا
ہوتا ہے اسی گھڑی سے وہ موت کا شکار ہو چکا ہوتا ہے البتہ موت اپنے شکار کے ساتھ کچھ دیر کھیلتی ہے
اور اسکو ہاتھ پاؤں مارنے کیلئے پوری ڈھیل دے دیتی ہے۔ اسی کو زندگی کہتے ہیں اور ہم یہ سمجھتے
ہیں کہ موت سے ہم کو رہائی مل گئی ہے۔ جب ایک بار موت کے ہاتھوں زندگی کا خاتمہ ہو چکتا ہے
تو مشیت اس کو دوبارہ پھر پیدا کرتی ہے اور کون دفساد کا یہ سلسلہ ہمیشہ کیلئے جاری ہے کیونکہ
مشیت کا کام یہی ہے کہ وہ اپنی خود بینی اور خود نمائی کا سلسلہ قائم رکھے۔

شوپنہار کہتا ہے کہ زندگی کی بنیاد خود غرضی اور نفسانیت پر ہے انسان فطرتاً بے رحم،
بزدل اور نفس پرست ہے وہ اگر ایماندار اور رحمدل خدا ترس نظر آتا ہے تو محض اسلئے کہ اس کو
ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں اسکی بدکرداریوں کے بدلہ میں آپکے ساتھ دوسرے بھی ویسا ہی
برتاؤ نہ کرنے لگیں اور پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ باوجود اس دوڑ دھوپ اور جدوجہد کے انسان اپنی
خواہشوں میں آخر کار ناکام رہتا ہے زندگی کی ابتداء ناکامیوں سے ہوتی ہے اور انجام کار بھی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ناکامی ہے۔ ناآسودگی گویا انسان کی قسمت میں ہے۔ اگر آج ہمکو آسودگی نصیب ہوجائے تو زندگی کے یہ سارے جھگڑے مٹ جائیں اور مشیت کی شکست ہوجائے۔ شوپنہار کا کہنا ہے کہ انسان کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ شکست کو کسی نہ کسی طرح زیر کرے۔ ورنہ زندگی کی گراں باریوں سے سبکدوشی نہیں مل سکتی۔ اگر ہم واقعی چاہتے ہیں کہ ہم کو زندگی کے مختلف روگ سے مستقلاً چھٹکارا مل جائے تو اسکی بہترین صورت یہ ہے کہ ہم دین اور دنیا کے تعلقات کو بالکل تج دیں۔ چنانچہ شوپنہار ہمکو ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے، ہمکو ایک لمحہ کیلئے جانکاہ حقیقت نہ بھولنی چاہیئے کہ زندگی کی اصلیت شور و شر ہے اور انسان جنم کا پاپی ہے۔ اگر ہم اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں تو پھر دنیا کو تج دینا ہمارے لئے کوئی دشوار کام نہیں مگر سب سے بڑی دشواری اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا ہے کہ "خطا و نسیان انسان کے خمیر میں ہے"۔ اس طرح شوپنہار ہم کو تہذیب نفس کی تعلیم دیتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو شوپنہار کے خیال میں فنون لطیفہ عشق اور مذہب سب کا نصب العین یہی ہونا چاہیئے کہ انسان کے دل سے حب دنیا کو نکال دیں اور اس کو رہبانیت کے راستہ پر لگا دیں۔ شوپنہار بھی میر کیطرح ہم کو زندگی کے مسئلہ کا آخری حل یہی بتاتا ہے ؎

کہا اسیر اس خرابے کی بہت اب چل کے سو رہیئے
کسی دیوار کے سائے میں منھ پہ لے کے داماں کو

شوپنہار کے اخلاقیات کی ابتداء دراصل اس کے نظریہ کردار سے ہوتی ہے، اسکے فلسفہ کو اگر بغیر ردو قدح کے مان لیا جائے تو انسان ہماری نظر میں ایک مجبور محض کٹھ پتلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ اس سے جو حرکات و سکنات سرزد ہوتے ہیں وہ صرف اندھی مشیت کے تقاضے ہوتے ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ پہلے سے متعین ہوتے ہیں۔ اس نتیجہ کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے ہم اسکو کسی فعل کا ذمہ دار نہیں قرار دے سکتے اور اس پر اچھے برے کا نہ تو حکم لگایا جاسکتا ہے اور نہ وہ جزا و سزا کا مستحق ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ جس کائنات میں اور چیزیں قدرت کے خاص خاص تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے حرکت کر رہی ہیں وہاں انسان بھی جو کچھ کرتا ہے وہ ایک خاص قانون کے تابع ہوتا ہے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پھر اس پر کوئی قطعی حکم کیسے لگا سکتے ہیں ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی :: جو چاہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا ۔

بہرحال یہ وہ خطرناک نتائج جن پر ہمکو شوپنہار کے فلسفۂ کائنات کی رہنمائی میں پہنچنا پڑتا ہے یہ بات شوپنہار کے دل میں ہمیشہ کھٹکتی رہی ۔ اور وہ اسکو دور کرنے کی برابر کوشش کرتا رہا اگرچہ اسکے بعد اسکا فلسفہ اور بھی الجھ کر رہ گیا ہے اور اسمیں تناقضات پیدا ہو گئے ہیں ۔

زندگی ایک قید بے زنجیر ہے جسمیں مشیت نے خود اپنے کو جکڑا ہے اسلئے اگر وہ چاہے تو اپنے کو اس زنجیر سے آزاد بھی کر سکتی ہے ۔ اسی نے اپنے کو بلاؤں میں مبتلا کر رکھا ہے اور یہی اپنے کو نجات دلا سکتی ہے ۔ بہرحال تحصیل نجات انسان کی زندگی کا مقصد ہے اور یہ نجات کائنات کے لئے نہیں بلکہ صرف افراد کے کیلئے ہے قبل اس کے کہ ابدی نجات نصیب ہو افراد کو تہذیب نفس کی مختلف منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور اپنی انانیت کو بتدریج ایثار اور ہمدردی کا تابع کرنا پڑتا ہے ۔ اس بات کو نہ بھولنا چاہئے کہ شوپنہار کے نقطۂ نظر سے ساری ہمدردی اور ایثار کی بنیاد عبرت پر ہے اور عبرت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسکی اصلیت خود پرستی ہے ۔

دنیا میں جتنے گناہ اور جتنی برائیاں ہیں ان سب کی ذمہ دار مشیت ہے جسکی بدولت ہر چیز وجود میں آتی ہے اور پھر جہاں کہیں گناہ یا شر ہے اس کے جواب میں معقولیت بھی موجود ہے مثلاً کسی ظالم کو دیکھئے جو جان بوجھ کر ظلم کرتا جا رہا ہے اور بظاہر ہمکو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی قسم کی سزا بھگتنی نہیں پڑتی ۔ مگر حقیقتاً یہاں ازلی انصاف کا قانون کام کر رہا ہے ۔ ظالم اور مظلوم میں دراصل کوئی فرق نہیں ہے ۔ ظالم کو یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ اس نے کوئی ظلم نہیں کیا اور مظلوم کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ۔ یہ دونوں غلطی پر ہیں کیونکہ دنیا میں جتنی تکالیف ہیں وہ مشیت کے صرف ایک گناہ یعنی خودنمائی کی سزا ہیں ۔ اور مشیت بحیثیت شے بالذات کے سب میں ایک ہی ہے اس سے زیادہ شوپنہار نے اپنے نظریۂ عدل کی وضاحت نہیں کی ہے ۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

شوپنہار کے نزدیک تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کی آخری منزل ترک دنیا ہے قدم قدم پر ہمکو تجربہ ہو چکا ہے کہ فتنہ و فساد ظلم و تشدد رنج والم کے سوا زندگی میں کسی اور چیز کا بالذات کوئی وجود نہیں۔ جس چیز کو ہم عدل و انصاف کہتے ہیں یا جسے ہم راحت و انبساط سمجھتے ہیں وہ محض عارضی ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ ہم کہتے ہیں کہ ہم کو اطمینان نصیب ہے تو ہماری مراد کیا ہوتی ہے ؛ صرف یہ کہ فی الحال ہمکو کوئی دکھ نہیں، تکلیف نہیں ہمیں اگر زندگی میں اطمینان اور مستقل امن مل سکتا ہے تو تیاگ کے ذریعہ۔ ہمارے اندر زندگی کی جو خواہش ہے اسکو مٹا دینا پڑے گا جیسا کہ سنیاسی اور بیراگی کرتے ہیں۔ تیاگ اور نجات ساری کائنات کیلئے نہیں بلکہ صرف افراد کیلئے ہے۔ ہم فرداً فرداً زندگی کے عذاب سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں اس کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ ہر تکلیف، ہر مصیبت کو ہنستے کھیلتے ہوئے برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں اور ایک نامعلوم گوشے میں زندگی بسر کریں۔

شوپنہار نے اپنے خیالات کو باضابطہ تربیت دے کر ایک نرالے فلسفہ کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ شوپنہار کو خود اس کے عہد میں شہرت نہیں ہوئی اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کے فلسفہ کا زیادہ حصہ جو معقول و مدلّل ہے وہ تخریبی ہے۔ بعد میں اسکو جو مقبولیت حاصل ہوئی اسکا راز اس کے جمالیات اور اس کے شاعرانہ طرز بیان میں مضمر ہے۔

قیصر قلندر

یادوں کو سلادوں کہ میں لمحوں کو پکاروں
اِس رات کے صحرا میں اکیلا ہی کھڑا ہوں

زخموں کے دیئے جلتے ہیں کیوں انکو بجھادوں
کیا تاروں بھری رات کا احسان اٹھادوں

پھولوں کی نہ سیج نہ کانٹوں کا ہے بستر
کس نام سے میں عمرِ گریزاں کو صدا دوں

چُبھتے ہیں میرے ذہن میں جب درد کے کانٹے
پھر دامنِ احساسِ طرب کیسے سنبھالوں

ہر سانس سے ڈر لگتا ہے سناٹا ہے کیسا
لمحوں کی یہ کٹتی ہوئی زنجیر ہلادوں

ویرانۂ احساس میں اک پھول کھلا ہے
میں وقت کی آندھی سے اسے کیسے بچالوں

صدیوں سے جسے راحتِ منزل نہ ملی ہو
اس خضر کو میں راہ نما کیسے بنالوں

قسمت میں کہاں ہیں وہ جہانگیر بہاریں
جن کے لئے برسوں سے ترستا رہا ہوں

بے باکیٔ اظہار سے مجبور ہوں قیصر
حق بات کہوں یا نہ کہوں سوچ رہا ہوں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سیف الدّین سیفیؔ

○

کل رات بھی کیا جانے ہم لوگ کہاں تھے
آئینے کا گھناہٹ کے پردے میں نہاں تھے

اک آگ سی سینے میں ہے کیا نام ہے اس کا
اپنے بھی تو یارو کئی انداز بیاں تھے

کیا جان کے صحرا کی طرف بھاگ رہے ہیں
کل تک جو نسیم سحری کے نگراں تھے

گم گشتہ تمناؤں سے کیا آنکھ ملاتے
کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے ہم بارِ گراں تھے

کیا میر کے انداز کا دعویٰ تھا کسی کو
جو لوگ یہاں آئے تھے سب اہل زباں تھے

کیا جانے کہاں بھول گئے آیا انہیں سیفیؔ
دل کے کسی کونے میں کئی ادراک و گماں تھے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اشرف صدیقی

فراق کی شاعرانہ اہمیت

دنیا کی ہر شئے تغیّر پذیر ہے اور اسی تغیّر میں ترقی کا راز مضمر ہے۔ اگر تغیّر نہ ہو تو کارخانۂ عالم بے کیف نظر آئے۔ زمانہ بدلتا ہے، ماحول بدلتا ہے اور سماجی رسم و رواج بدلتا ہے۔ تہذیب بدلتی ہے اور تمدن بدلتا ہے، معاشرت بدلتی ہے اور نظام بدلتا ہے۔ انسان مجبور نہیں مختار ہے۔ جب اسکی راہوں میں رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں تو آمادۂ پیکار ہوتا ہے —— ماحول سے، سماج سے اور اپنی تہذیب سے۔

ادب و شعر کی دنیا میں بھی اس قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں —— تجربات میں، ہئیت میں، موضوع میں اور انداز بیاں میں۔ قطب شاہی عہد کی شاعری کچھ اور تھی، ولی کے بعد شاعری میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ غالب نے کچھ اور دیا۔ حالی کے بعد شاعری میں نئے رجحانات، تجربات اور اسالیب نے جگہ پائی۔

اردو شاعری میں ۱۸۵۷ء ایک نئے دور کے آغاز کا پیش خیمہ تھا۔ ۵۷ء میں غدر ہوا، ذہنی تبدیلی آئی، حالات بدلے۔ اس کے نتیجے میں خیالات نے بھی ایک نیا موڑ اختیار کیا۔ ادب زندگی کا پرتو ہوتا ہے۔ اسلئے ادب میں بھی نئے رجحانات پائے جانے لگے۔ حالی سے اردو شاعری میں ایک جدید دور کا آغاز ہوتا ہے جو اکبر اور اقبال سے ہوتا ہوا عہد حاضر کے مختلف شاعروں حسرت، اصغر، جگر، جوش، مجاز، جذبی، جمیل مظہری اور فراق تک پہنچتا ہے۔ ہم ان سب کے یہاں انفرادی طور پر ایک نیا تجربہ، ایک نیا انداز اور ایک نیا خیال پاتے ہیں اور یہ اپنی اسی انفرادیت کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اردو شاعری میں انقلاب آیا لیکن غزل کی صنف اپنی جگہ پر قائم رہی۔ حالی اور آزاد نے مضامین میں انقلاب لانے کی کوشش کی اور غزل کو رانہ تقلید سے آزاد ہوکر کھلی فضا میں سانس لینے لگی۔ "غزل کی موجودہ ہمہ گیری بیسویں صدی کے اکابر غزل گویوں کا عطیہ ہے" — رشید احمد صدیقی کی زبان میں ان پچاس سال کو اردو غزل کا عہد زریں کہنا مناسب ہوگا۔

فراق اس نصف صدی کے ممتاز غزل گو شعرا میں اپنا ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ فراق نے غزل کو نئے رجحان سے آشنا کیا۔ اس کو ایک نیا انداز اور ایک نیا آہنگ دیا، ایک نئی لَے اور ایک نیا تجربہ عطا کیا، ایک نئے خیال سے نوازا —— جو اردو غزل کی روایت میں فال نیک ہے۔

فراق کو سمجھنے کیلئے ان کے ماحول اور ذوقِ ادب سے باخبر ہونا ہوگا۔ انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی وہ آریائی ماحول ہے۔ لہٰذا وہ ہندی شاعری اور اسکی روایت سے بخوبی واقف ہیں۔ موجودہ ہندی میں کھڑی بولی، برج بھاشا اور اودھی کی روایتیں پوشیدہ ہیں۔ فراق فارسی اور عربی کے بھید بھاؤ سے اتنے واقف نہیں جتنا کہ ہندی کے بناؤ سنگار سے۔ اس لئے فراق کا لہجہ اور آہنگ چونک جانے پر مجبور کرتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار :

قاتل اس کو کون کہے —— ہنس مکھ آنکھیں کومل گات

ہر سانس کوئی مہکی ہوئی نرم سی لَے ہے

لہراتا ہوا جسم ہے یا ساز ہے لرزاں

عربی اور فارسی شاعری میں محبت کا اظہار مرد کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ لیکن ہندی شاعری میں محبت کا آغاز عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہندو مذہب میں مرد اور عورت کے جنسیاتی تعلق کو تقدس کا درجہ عطا کیا گیا ہے۔ فراق ہندو دیومالا سے بخوبی آگاہ ہیں جس کا عکس ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ وہ قدیم آریائی تہذیب کی جلوہ نمائی کرتے ہیں۔ ایک شعر سنئے :

لہرائی ہوئی قوس قزح قامت رنگیں

اٹھتے ہیں قدم یا لہک اٹھتا ہے گلستاں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اس کے ساتھ ہی فراقؔ انگریزی ادب پر گہری بصیرت رکھتے ہیں۔ وہ اس کے ادا شناس اور نباض بھی ہیں۔ فراقؔ کی شاعری میں ہندی ادب کی روایات اور انگریزی ادب کے شعور کا گہرا پتہ چلتا ہے۔ مشرق و مغرب کے دھارے فراقؔ کی شاعری میں مل کر گنگا جمنی رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ انگریزی ادب کے زیرِ اثر ان کی شاعری میں تنقیدِ حیات بھی ملتی ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی اور اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ ان کے یہاں انسانیت بہت بڑی نیکی ہے۔ بلند عزائم بھی ملتے ہیں جو بامِ عرش تک لے جانے میں نہیں ٹھکتے نہیں۔ اشعار سنئے ؎

ہمیں سے پستیاں اُبھریں، ہمیں سے رفعتیں چمکیں
نہ پوچھو ہم سے اے ارض و سما ہم کون ہیں، کیا ہیں

فراقؔ اس دکھ بھری دنیا کو جانے تو نے کیا سمجھا
اگر ہوں دیکھنے آنکھیں درِ فردوس بھی وا ہیں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

عناصر سے ہم آہنگ ہو کر ان کی شاعری میں رچ لبس گئی ہے۔ انھوں نے حسن کو اچھی طرح دیکھا ہے اور اس سے لمس بھی حاصل کیا ہے لیکن بے راہ روی کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ رند اور صبا جیسی عریانیت سے پرہیز کرتے ہیں۔ اشعار کے آئینہ میں حسن یار کی تصویر دیکھئے ؎

اُف یہ مہکی ہوئی سُہانی رات چہرۂ شب کی آب و تاب ہے تو

جیسے نغمے لب فراق سو جائیں سیج پر یوں ہی محو خواب ہے تو

جیسے کوئی سوئی ہوئی دنیا جاگ اُٹھے اسکے بدن کی لویں ہیں نغمات سحر

ان کی عشقیہ شاعری جمال انسانی کے احساس اور اس کی عظمت کی شاعری ہے۔ اس میں میرؔ کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے اور سر توڑنے کا تصور نہیں ملتا۔ مصائب و آلام اور رنج و تکالیف کو عشق کی آنچ میں تپا کر کندن بنا دیتے ہیں تب اپنی شاعری کے مندر میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ میرؔ کے یہاں بھی عشق کی بلندی اور پختگی ملتی ہے لیکن وہ اپنی اس انفرادی فضا کو آفاقی نہ بنا سکے ۔۔ جہاں ایک نصب العین ملتا اور حیات انسانی کیلئے چند کرنیں مہیا ہوتیں۔ وہ تو یہ کہتے ہیں ؎

عالم عالم عشق جنوں ہے، دنیا دنیا تہمت ہے

دریا دریا روتا ہوں، صحرا صحرا وحشت ہے

فراقؔ کی عشقیہ شاعری کی اڑان میرؔ سے بلند ہے۔ کیفیت پرواز قابل دید ہے ؎

جاتی ہے ہو کے زیر فلک راہ عشق بھی

جو بار ہو اٹھا، پڑے جو سہے چلو

اردو شاعری میں ولیؔ سے فراقؔ تک عشق اپنے مخصوص معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ ولیؔ کے یہاں عشق معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے، میرؔ کے یہاں رونے، شب ہجر میں تڑپنے، کروٹیں بدلنے اور آہیں بھرنے کا نام، غالبؔ کے یہاں تحلیل نفسی میں نمایاں، اقبالؔ کے یہاں عشق ذریعہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

عمل، فانی کے یہاں احساسِ شکست، اصغر کے یہاں عشق شکستگی سے دور بلند حوصلہ پروازی، جگر کے یہاں عشق مستی اور بے خودی کا ہم نوا، یگانہ کے یہاں زندگی کا ہم ساز اور فراق کے یہاں عشق اور زندگی لازم وملزوم۔

المختصر فراق کے یہاں عشق جذبہ انسانی کے روپ میں ظاہر ہوا ہے جہاں انسان سے محبت اور ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے۔ عاشق کا دل دردمند ہوتا ہے۔ ہلکی سی خراش پر بے چین ہو جاتا ہے، پکار اٹھتا ہے ؎

ذرّہ ذرّہ کانپ رہا ہے
کس کے دل میں درد اُٹھا ہے

یہ آواز نہاں خانۂ دل کی ہے، جہاں انسان کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ شاعر کے حسی تجربے نے اسے آفاق گیر ئے عطا کی ہے جو سارے عالم پر چھا جاتی ہے۔

مغرب کے جمالیاتی تصور نے انکے مزاج کو رومان پرور بنا دیا ہے جس سے انکی غزلوں میں رفعت اور بلندی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن اکثر نشۂ رومان ان کی شاعری میں ایک غیر مانوس فضا پیدا کر دیتا ہے، جو بے کیف سی نظر آتی ہے۔ بسیار گوئی سے ان کی غزلیں طویل ہو جاتی ہیں جو لکھنوی دور کی یاد دہانی کراتی ہیں۔ اس طوالت کی وجہ سے اکثر اشعار بھرتی کے نظر آتے ہیں۔ شاید انکے مزاج اور طبیعت کی ناموزونی کا اثر ہے۔ بعض غزلیں اپنی سادگی اور سلاست کی وجہ سے لائق توجہ ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو غزلیں ہیں ان میں میر کی طرح آب داری اور تاب ناکی ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو   تم کو دیکھوں یا تم سے بات کروں

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تم نے تو خیر بے وفائی کی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تو تھا یا کوئی تجھ سا تھا
مری راہ میں کون کھڑا تھا

نئی ترکیبوں اور نئے استعاروں کی جلوہ گری بھی دیکھئے ؎

ناشنیدہ نغمہ ہے ہر اک نگاہ
بے صدا جھنکار ہیں آنکھیں تری
لہلہاتی ہیں نگاہیں دھنک سی
جھیل کا گلزار ہیں آنکھیں تری

○

کیا ہیں یہ بے شمار شمس و قمر
سوزِ پنہاں کی ایک چنگاری

○

ابل پڑیں جن سے حیات کے چشمے
شرار و سنگ کو ایسا نچوڑ سکتا ہوں

مختصر یہ کہ فراق نے حسن و عشق کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے، ہر بار ایک نیا تجربہ حاصل کیا ہے اور نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ انکے یہاں حسن اور متعلقات حسن، عشق اور کیفیات عشق کی ضیاباریاں ہیں۔

بایں ہمہ فراق اپنی خاص لَے اور آہنگ کی وجہ سے ہی پہچانے جاتے ہیں جو ان کے شاعرانہ مقام کے تعین میں ناقدین کیلئے راہ نما ثابت ہوتے ہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بلراج پوری

آئنسٹائن صدی

سائنس دانوں نے اپنی سائنس پر نظرِ ثانی کی اور فلاسفروں نے اپنے فلسفہ پر جب ۱۹۰۵ء میں ایک گمنام کلرک کا مضمون سائنس کے کسی جریدہ میں چھپا، جس نے کائنات کے معمہ کا راز دریافت کرنے کا دعوےٰ کیا تھا۔

اُس گمنام کلرک کے جنم دِن کی صد سالہ تقریبات آج سارا عالم اِس دور کے سب سے بڑے سائنسدان اور ایک عظیم انسان کے طور پر منا رہا ہے۔ مگر لڑکپن میں اس ہونہار برِوا کے کوئی پات چکنے نظر نہ آتے تھے۔ اس کے اُستاد کہتے تھے کہ لڑکا ذہنی طور پر سست ہے اور سپنوں کی دُنیا میں کھویا رہتا ہے۔ کون جانتا تھا کہ اُس کی دنیا ہماری حقیقی دُنیا سے زیادہ حقیقی ثابت ہوگی ــــــــ

البرٹ آئنسٹائن نے آج سے سو برس پہلے ۱۴ مارچ ۱۸۷۹ء کو جنوبی جرمنی کے شہر الم میں جنم لیا۔ اور اپنا زیادہ تر بچپن میونک میں گذارا۔ بچپن کے ناقابلِ فراموش واقعات میں اُسے اپنے باپ کے دو تحفے یاد رہے۔ پانچ برس کی عمر میں مقناطیسی قطب نما اور بارہویں برس میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جیومیٹری کی کتاب ۔ اپنی ماں سے اس نے سنگیت سیکھا۔ قطب نما، جیومیٹری اور وائلن کے گرد ہی اُس کی ساری زندگی گھومتی رہی ۔ ستاروں کی گردش میں وہی ترتیب اور لے ہونی چاہیے، جو وائلن کی سُروں میں ہوتی ہے ۔ آئنسٹائن کے لئے سنگیت اور سائنس ایک ہی علم کے دو پہلو تھے ۔

سکول میں کتابوں کے سوا اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ جب وہ سیکنڈری سکول میں داخل ہوا، تو اس کا باپ کاروبار کیلئے اٹلی چلا گیا اور آئنسٹائن میونک میں مزید اکیلا ہو گیا۔ ۱۶ سال کی عمر میں سکول کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد باپ نے صلاح دی کہ "فلاسفرانہ جہالتوں" کو چھوڑ کر کاروبار کی طرف رجوع کرو۔ مگر ضدی بچے کی بات مان کر باپ نے اسے ریاضی کی مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی ۔

بڑی مشکل سے اسے زیورچ کی پالی ٹیکنک اکادمی میں داخلہ ملا ۔ وہاں ریاضی اور فزکس کے علاوہ آئنسٹائن نے شوپن ہاور اور کانٹ کے فلسفہ، ڈارون کے نظریہ ارتقا اور اشتراکیت کی معیشت کا مطالعہ کیا اور جوشیم کی وائلن سنی ۔ ڈگری لینے کے بعد، نوکری حاصل کرنے کیلئے اُس نے کئی سکولوں اور کالجوں کے دروازے کھٹکھٹائے ۔ مگر سب جگہ جواب ملتا رہا۔ ایک وجہ یہ بھی کہ وہ یہودی تھا ۔

آخر ۱۹۰۲ء میں آئنسٹائن سوئٹزرلینڈ کے پیٹنٹ دفتر میں کلرک کی اسامی پر نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ایک ہم جماعت لڑکی سے شادی کر لی ـــــ دفتر کے کام کی بجائے وہ اکثر ستاروں کے خوابوں اور حساب کے اربعوں میں کھویا رہتا اور فزکس کی ایک نئی تھیوری بنانے میں مصروف رہا ۔

بڑی عاجزی سے آئنسٹائن نے اخبار کے ایڈیٹر سے درخواست کی کہ اس کے مضمون کیلئے اپنے اخبار میں کوئی جگہ نکالے ۔ ایڈیٹر رضامند ہو گیا ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اسکی یہ رضامندی ایک تاریخ ساز واقعہ بن گیا ۔

اُس میں کائنات کا راز اور اُس سے بڑھ کر ایٹم کا راز پنہاں تھا ۔ فلاسفروں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نے اس میں ہستی کا راز پایا۔ سائنسدانوں نے اس سے انسان کو کرۂ زمین کی لاکھوں برس کی قید سے آزاد کرنے کا راز پایا اور جنگ بازوں نے اس سے نوعِ انسان کا نام و نشان مٹانے کا راز حاصل کیا۔

۱۹۰۵ء کا سال سائنس کی دنیا میں ایک انقلابی سال تھا جب آئنسٹائن نے سائنس پر نیوٹن کے دو سو سالہ تسلط کو ختم کیا۔ اس نے بالکل اسی طرح نئی سائنس کی بنیاد رکھی، جس طرح اپنے وقت میں نیوٹن نے ارسطو کا تسلط ختم کرکے ایک نئی سائنس کی داغ بیل ڈالی تھی۔

اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ مادہ کی کُل مقدار اور قوت کی کُل مقدار معین ہیں۔ جن میں کمی و بیشی ناممکن ہے۔ آئنسٹائن نے بتایا کہ انہیں ایک دوسرے میں تبدیل کرنا ممکن ہے۔ اور اس طرح ان کی مقداروں میں کمی و بیشی ہو سکتی ہے۔ اس نے انہیں تبدیل کرنے کا فارمولا بھی پیش کیا۔ جس کے مطابق مادہ کی مقدار کو روشنی کی رفتار سے دوبار ضرب دینے سے اس کے برابر قوت پیدا ہو سکتی ہے۔ یعنی قوت = مادہ × روشنی کی رفتار × روشنی کی رفتار۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ تھوڑی سی مقدار سے بے پناہ قوت پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے۔ اس حساب سے اگر ایک پونڈ کوئلہ پوری طرح قوت میں تبدیل ہو سکے، تو اس سے ایک کھرب کلوواٹ اس پاور بجلی حاصل ہو سکے گی۔ اس فارمولا سے سورج کی قوت کا راز بھی سمجھ آیا۔ سورج اور گرمی اسی ایندھن کے جلنے سے نہیں بلکہ اُس کے مادہ کی قوت میں تبدیلی کی وجہ سے ہے، جس کی تھوڑی سی مقدار بھی ہزاروں سال کے لئے قوت مہیا کر سکتی ہے۔

یہی اصول ایٹم بم بنانے والوں کے کام آیا۔ یورنیم یا کسی اور غیر مستحکم ایٹم والی دھات کی تھوڑی سی مقدار کے ایٹموں کو توڑنے سے بے شمار قوت پیدا ہوتی ہے۔ جسے تباہی کے کام لایا جاتا۔ ۶ر اگست ۱۹۴۵ء کو ایک ایسے ہی بم نے جاپان کے شہر ہیروشیما میں ساٹھ ہزار اشخاص کو موت کی نیند سلا دیا تھا اور ایک لاکھ کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ روس اور امریکہ ۱۰۰ میگاٹن کے تجربہ کر رہے ہیں جبکہ ایک میگاٹن جنگ کے وقت جاپان پر گرائے گئے بم سے ایک لاکھ گنا زیادہ ہے۔

جنگ کے بعد سائنسدان کے اندر انسان کا دل پگھل گیا اور ایک جاپانی دفعہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سے اس نے بلک بلک کر معافی مانگی اگرچہ ایٹم بم اُس نے نہیں بنایا تھا۔ اُس نے صرف ایٹمی طاقت کا اصول دریافت کیا تھا۔

نیوٹن نے کہا تھا کہ ہر چیز ساکن ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ آئنسٹائن نے اعلان کیا کہ ہر چیز ہر وقت حرکت میں رہتی ہے۔ مگر چیزوں کی حرکت ایک دوسرے کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اگر دو چیزیں ایک سمت میں ایک جیسی رفتار سے حرکت کریں، تو وہ ایک دوسرے کیلئے ساکن ہوں گی مگر باقی سب کے لئے متحرک کسی حرکت کی رفتار مشاہدہ کرنے والے کی رفتار اور رُخ کی نسبت سے طے ہوگی۔ چلتی گاڑی کی رفتار ساکن آدمی کے لئے ایک ہوگی، اُسی سمت میں جانیوالی دوسری گاڑی میں بیٹھے آدمی کے لئے دوسری ہوگی اور مخالف سمت میں جانے والی گاڑی میں بیٹھے آدمی کے لئے تیسری ہوگی۔

رفتار اور رفتار کے رُخ کے علاوہ کسی چیز کی جسامت بھی مشاہدہ کرنے والے کی پوزیشن پر منحصر ہے۔ حرکت سے چیزوں کی جسامت چھوٹی ہو جاتی ہے۔ اگر ایک گز لمبائی کی چھڑی کو روشنی کی رفتار سے حرکت میں لانا ممکن ہو، تو اس کی لمبائی صفر رہ جائیگی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف وقتوں میں اس کی لمبائی مختلف تھی۔ اس طرح لمبائی یا فاصلہ کی ہستی وقت کی نسبت سے ہے۔ وقت کی بھی آزاد ہستی نہیں۔ اس کی نوعیت بھی دیکھنے والے کی پوزیشن کے مطابق بدل جاتی ہے۔ ہمارا وقت ہماری دنیا کی ہی چیز ہے۔ ہر دنیا، ہر سیارے اور ستارے کا اپنا وقت ہے۔ جو ہمارے لئے آج ہے، وہ کسی دوسری دنیا کیلئے کل ہوگا اور تیسری کیلئے پرسوں کئی ستاروں کی جو روشنی ہمیں آج نظر آتی ہے۔ وہ سینکڑوں ہزاروں سال پہلے چلی ہوگی۔ ہمارے لئے وہ ستارہ آج حقیقت بنا۔ شاید اُس ستارہ یا کسی اور ستارہ کے لوگوں کے لئے اس کی ہستی ہی ختم ہو گئی ہو۔ اس طرح اس زمین کا آج کا کوئی نظارہ کسی سیارے تک ہزاروں سال بعد پہنچ سکتا ہے۔ روشنی کے پہنچنے کا عرصہ فاصلہ پر منحصر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی سیارہ کے لوگ آج مہابھارت کی لڑائی کا حال دیکھنے کے قابل ہوئے ہوں، جہاں زمین کی روشنی آج پہنچی ہو اور جن کے پاس زمین کے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نظارے دیکھنے کے آئے موجود ہوں۔ اس طرح جسے ہم ماضی بعید کہتے ہیں، اسے وہ حال سمجھیں گا۔ اصولی طور پر حال سے ماضی یا مستقبل میں جانا اُسی طرح ممکن ہونا چاہیئے جس طرح زمین سے چاند یا مریخ تک۔ کیونکہ وقت کی ہستی فاصلہ کی نسبت سے ہے اور فاصلہ کی ہستی وقت کی نسبت سے ہے۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ فاصلہ یا لمبائی کی ہستی بدل جاتی ہے اور فاصلہ کی تبدیلی کے ساتھ وقت کی ہستی بدل جاتی ہے۔

اس طرح ہر تجربہ اور مشاہدہ کی حقیقت تجربہ اور مشاہدہ کرنے والے کی حیثیت سے جانی جا سکتی ہے۔ کوئی حقیقت مطلق اور غیر مشروط نہیں۔ حقیقت جاننے کیلئے اُسے ہر نسبت سے جاننا چاہیئے۔ فاصلہ، رفتار، اختیار کا رُخ اور وقت۔ آئنسٹائن نے اس تھیوری کو ریلے ٹی وی ٹی یعنی نسبتی علم کا نام دیا۔ موسیقار سائنسدان نے کائنات کے مختلف پہلوؤں۔ وقت اور فاصلے میں پہلی بار ایک تال اور سُر ڈھونڈ نکالی۔

عالم کی شخصیت کا سکہ جمنا شروع ہو گیا اور اُس کا شمار تاریخ کے عظیم سائنسدانوں میں ہونے لگ گیا۔۔۔۔۔ مگر آئنسٹائن کو اپنی ہی دُھن تھی۔ وہ سچائی کی مزید گہرائیوں تک غوطہ زنی کرنا چاہتا تھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے اُسے کچھ ٹھیس پہنچائی۔ حساس دل چلا اٹھا "جنگ ایک شیطانی اور حیوانی جُرم ہے۔ میں اس میں حصہ لینے کی بجائے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو ترجیح دونگا۔"

مگر وہ پھر اپنی دُنیا میں کھو گیا۔ اردگرد کے شور و غل، اُتھل پتھل اور خون خرابے سے بے نیاز آئنسٹائن کائنات کی نئی گتھیاں کھولنے، نسبتی علم کی نئی وضاحتوں و تشریحوں اور دائمی کی نئی دھنوں میں مگن ہو گیا۔

اب تک آئنسٹائن کا سارا علم حسابی اور منطقی نکتہ نگاہ سے ہی ٹھیک سمجھا جاتا تھا۔ خلاؤں کے وقت اور فاصلہ کو ماپنا کہاں آسان تھا۔ مگر ۱۹۱۹ء کے سورج گرہن نے عملی ثبوت بھی مہیا کر دیئے۔ روشنی کے جھکاؤ کے انداز اور زاویے کے بارے میں اُس کے اندازے گرہن کے عملی مشاہدوں سے حاصل نتائج کے عین مطابق نکلے۔ آئنسٹائن کی عظمت کا لوہا مکمل طور پر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مان لیا گیا۔ ایک ہی دن میں اُس کی شہرت ساتوں آسمانوں تک جا پہنچی۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں اُسے نوبل پرائز ملا۔ اپنی شہرت کی خبریں سن کر سائنسدان نے کہا "ہر کوئی میرے بارے میں بات کرتا ہے مگر مجھے سمجھتا کوئی نہیں"۔ شہرت سے گھبرا کر اس نے کہا "لوگ مجھے سرکس یا ایک نیا عجیب جانور سمجھتے ہیں۔ شہرت سے ہمیشہ بیوقوفی میں اضافہ ہوتا ہے، وہی حال باقی ہو رہا ہے"۔

اپنے رتبہ کو آئنسٹائن نے سائنس اور اسے گرد و پیش پھیلانے کیلئے استعمال کیا۔ جنگ کے بعد اُس نے اپنی شخصیت کے ذریعے فاتح اور مفتوح قوموں میں دوستی کا رشتہ کرنے کی کوشش کی۔

ابھی وُہ امریکہ کے دورہ پر تھا کہ ہٹلر نے جرمنی کی عنان حکومت سنبھالی لی۔ اور جمہوری نظام کے خاتمہ کے بعد یہودیوں کے صفایا کی مہم شروع کر دی۔ آئنسٹائن کا گھر جلا دیا گیا اور اس کے سر کی قیمت بیس ہزار مارک مقرر ہوئی! اپنے وطن کا یہ حال دیکھ کر اُس نے امریکہ کی شہریت اور پرنسٹن یونیورسٹی میں پروفیسری کا عہدہ قبول کر لیا۔ اور علم کی حدوں کو توسیع دینے کی جد و جہد جاری رکھی۔ اس نے اپنے اس رول کی خاطر نئے یہودی ملک اسرائیل کا صدر بننے کی پیشکش ٹھکرا دی۔

اس صدی کی ہر ایجاد اور دریافت آئنسٹائن کے سائنسی علم کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ واحد سائنسدان ہے جسکی سائنسدان بھی پرستش کرتے ہیں۔ جس نے سائنس اور فلسفہ کے ہر میدان کو اثر انداز کیا۔ زندگی کے آخری دنوں میں آئنسٹائن نے جنگ کے مستقل خاتمہ کیلئے زبردست تحریک شروع کی ـــــ ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء کو یہ عظیم سائنسدان اور عظیم انسان چل بسا۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سیّد محمد فاروق بخاری

محمود غزنوی اور تسخیر کشمیر

عربوں نے کشمیر کو اپنی تسخیر میں لانے کیلئے کئی بار کوششیں کیں مگر اُنکے پیہم حملوں کا یہ سلسلہ کوئی خاص کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہی ۲۷۰ھ میں اختتام کو پہنچ گیا۔ عربوں کے بعد وسطِ ایشیاء کے مسلمان فاتحین نے اس میدان میں قدم رکھا۔ ان میں مشہور و ممتاز فاتح سلطان محمود غزنوی کا نام سرفہرست ہے۔

سلطان محمود نے کشمیر کو اپنے قبضے میں لانے کیلئے تین[۳] بار قسمت آزمائی کی۔ کشمیر کی تاریخیں محمود کے حملوں سے متعلق صحیح معلومات بہم نہیں پہنچاتی ہیں۔ سنسکرت میں لکھی گئی تواریخ بھی معمولی اشاروں پر اکتفا کرتی ہیں۔ جبکہ فارسی تذکرے مبالغہ آمیزی سے پُر ہیں جس کی بنا پر وہ بھی قطعاً ناقابلِ اعتبار ہیں۔ مستند ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود کشمیر کی وادی میں کبھی داخل نہ ہوسکا۔ مگر مولوی غلام حسن مرحوم لکھتے ہیں کہ محمود نے بیجبہاڑہ کے ایک مندر کے اسبابِ زر و طلاء بھی ضبط کئے۔ بلکہ کشمیر کے راجہ سنگرام نے محمود کو تحفہ و تحائف پیش کئے۔ مورخ مذکور مُلّا احمد علامہ کے حوالے سے لکھتا ہے :-

"سنگرام راج تاب تقابُل در خود ندیدہ با تحائف و نفائسِ بسیار خود را

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بملازمت رسانید۔ سلطان فرمود چرا خود را رنجور کردی۔ راجہ در جواب گفت

کہ اہل اکرام خدمت و تواضعِ مہمان موجبِ افتخار و ترقی اعتبار خود پندارند"[1]

یعنی سنگرام راجہ نے جب اپنے اندر سلطان محمود کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ پائی تو کافی تحفے اور قیمتی چیزیں لیکر بادشاہ کے پاس آیا۔ سلطان محمود نے کہا: یہ تکلیف کیوں کی؟ تو راجہ نے اس کے جواب میں کہا: کہ اہلِ اکرام مہمان کی خدمت اور خاطر داری کرنا اپنے لئے موجبِ فخر و ترقی خیال کرتے ہیں"۔ سلطان محمود، بادشاہ کشمیر کی حسنِ تقریر سے محظوظ ہوا اور کشمیر کی سلطنت اسی کے حوالے کر کے واپس لوٹا..... مگر یہ سارا بیان ایک افسانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ہے۔

بلاشبہ محمود غزنوی کے کشمیر پر حملے ہندوستان کی تاریخوں میں زبردست اہمیت کے حامل ہیں۔ نہ صرف تواریخ ہند بلکہ مؤرخین ایران نے بھی ان حملوں کا بڑی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ محمود کی ایک مہم کا تذکرہ مشہور فارسی شعراء کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ فرخی سیستانی کے یہ اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

مجلس بلبِ جوئے برائے ششمۂ خوباں
کز گل چو بنا گوش تو گشتہ است لبِ جوئے

از مجلسِ ما مردم دو روی بر و کن
پیشِ آدمی سرخ و فرو کن گلِ دو روی

تا روز بشادی بگزاریم کہ فردا
وقتِ رمِ غزو آمد و ہنگام تکاپوی

گاہ است کہ یکبار بکشمیر خرامیم
از دستِ بتاں پہنہ کنیم از سر بت گوی

---

[1] تاریخ حسن ج ۲ ص ۱۱۵

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بس شہر کہ مردانش باما بچخیدند

کامروز نبینند در او جز زنِ بے شوی[1]

عصرِ حاضر کے محققین لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کشمیر پر اپنا قبضہ جمانے کا ارادہ شروع سے رکھتا تھا۔ اس کی ہند کے تمام مشہور مندروں پر نظر تھی اور وہ چاہتا تھا کہ خدا اسکو بُت گر کے بجائے بت شکن کہہ کر پکارے۔ اِس لئے تمام بُت خانے اس کے سامنے ایک ایک کر کے آتے گئے جن سے کشمیر کے مندر اور وہار علیحدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ کشمیر اس زمانے میں ہزاروں مندروں سے معمور تھا۔ عباس پرویز لکھتے ہیں:۔

سلطان محمود کے تصرفات میں دن بدن اضافہ ہونے لگا اور ہندوستان کے تمام علاقے اس کے مقبوضہ ممالک کے ساتھ شامل ہوئے اور دینِ اسلام کشمیر کو چھوڑ کر (جہاں کے لوگوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا) تمام اطراف و اکناف میں پھیلا۔ کشمیر کے لوگ بُت پرستی میں وقت گزارتے تھے۔ اس لئے سلطان محمود ان کی سرکوبی اور یہاں کے مندروں کو منہدم کرنے کا منتظر تھا۔[2]

سلطان محمود کو کشمیر کے اندرونی حالات سے باخبر کرنے کیلئے یوں تو بہت سے ہندو فوجیوں کی مدد شاملِ حال تھی مگر صحیح معلومات بہم پہنچانے کیلئے ایک خاص شخص دربار میں موجود تھا۔ اس شخص کا نام تلک تھا جو ایک کشمیری حجام زادہ تھا۔ ابوالفضل دبیر بیہقی، جس نے تلک کی تعریف میں کئی صفحات سیاہ کئے ہیں، لکھتا ہے:۔

این تلک پسرِ حجامی بود ولیکن لقائی و مشاہدتی و زبانِ فصیح داشت۔

---

[1] تاریخ دیالمہ و غزنویاں: عباس پرویز، مطبوعاتی علی اکبر علمی، ایران: ص ۲۵۵

[2] تاریخ دیالمہ و غزنویاں: ص ۲۵۵

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

وخطی نیکو بہ ہندوی وفارسی۔ مدتی دراز بکشمیر رفتہ بود وشاگردی کردہ

..... وازآنجا قاضی شیراز ابوالحسن آمد وبگروید[1]

یعنی یہ تلک حجام کا بیٹا تھا لیکن خوبصورت اور فصیح البیان تھا۔ ہندی اور فارسی میں اس کا خط عمدہ تھا۔ کافی وقت تک کشمیر میں رہا اور یہیں تعلیم بھی حاصل کی۔ پھر یہاں سے شیراز کے قاضی ابوالحسن کے پاس آیا اور اسی کا ہو کر رہا۔

تلک نے محمود کو کشمیر کے حالات و واقعات سے ضرور باخبر کیا ہوگا۔ وہ اس کے خاص مصاحبین میں سے تھا۔ تفصیل کیلئے تاریخ بیہقی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

سلطان محمود نے ۱۰۰۲ء میں ہند کے راجہ جے پال کو شکست دی۔ جے پال نے اپنے آپکو زندہ جلادیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا انند پال تخت نشین ہوا۔ اس نے محمود کے خلاف اپنی کوشش برابر جاری رکھی۔ مگر ۱۰۰۹ء میں اس نے محمود کے ہاتھوں شکست کھائی۔ انند پال بھاگا اور کشمیر کے پہاڑوں میں پناہ لی[2] انند پال کی اس شکست کے چند سال بعد اس کا بیٹا ترلوچن پال اپنی بچی کھچی سلطنت، جو اب کوہستانِ نمک تک محدود رہ گئی تھی، کی حفاظت کیلئے میدان میں اترا۔ ترلوچن نے محمود کا مقابلہ کرنے کیلئے کشمیر کے معاصر راجہ سمگرامہ راجہ (۱۰۰۳ء – ۱۰۲۸ء) سے مدد کی درخواست کی۔ سمگرامہ راجہ نے درخواست قبول کی اور ترلوچن کی مدد کیلئے فوج کی ایک بڑی تعداد "تُنگ" کی کمانداری میں بھیجدی۔ سلطان محمود کو پہلے ترلوچن کی فوج کے ساتھ ایک وادی میں، جو جہلم کے راستے سے کشمیر سے ملتی تھی، مقابلہ کرنا پڑا۔ کشمیری کمانڈر "تُنگ" نے پہلی بار محمود کی فوج کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا مگر اس نے اپنی کامیابی سے دھوکہ کھاکر مزید آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اب محمود بذاتِ خود

---

[1] تاریخ بیہقی، ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی دبیر: تصحیح، دکتر غنی و دکتر فیاض، چاپخانہ ملی طہران بض ۲۱۴

[2] زین الاخبار: ص ۱۷۸ نیز DYNASTIC HISTORY OF NORTHERN INDIA H.C. RAY P-113

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اپنی فوج کے ساتھ دشمن کی طرف بڑھا۔ ترلوچن نے ننگ کو ایک چٹان کے نیچے چھپنے کا مشورہ دیا مگر وہ ترلوکن کے مشورہ کو درخور اعتناء نہ سمجھتے ہوئے محمود کا مقابلہ کرنے کیلئے آگے بڑھا۔ محمود نے اسے شکست دیدی اور فرار ہونے پر مجبور کیا۔ ترلوچن نے حالات قابو میں لانے کی کوشش کی مگر محمود نے اسے بھی شکست دی۔ یہ ۱۰۰۴ء کا واقعہ ہے۔ ترلوچن نے شکست کھائی اور اب محمود نے یہاں کے اطراف و مضافات مکمل طور پر اپنی تسخیر میں لے لئے۔ ابو سعید گردیزی کے یہ الفاظ قابل ذکر ہیں۔ ان سے کشمیر میں اسلام کی اشاعت پر روشنی پڑتی ہے:

وامیر محمود فرماں داد تا آں قلعہا کہ اندراں درۂ کشمیر بود بگرفتند و غارت کردند۔ ولشکر ازاں قلعہا بسیار غنائم بردہ یافت و بسیار کافراں باسلام آمدند۔ واندریں سال فرمودند ہر جائے کہ کشادہ بود از دیارِ کفار مسجد ہائے جامع ساختند و اُستاداں را فرمود تا بہر جائے بفرستادند، تا مر ہندواں را شرائط اسلام بیاموختند وخود با ظفر و فیروزی سوی غزنین آمد۔ وایں فتح بنا نہ اندر سنہ خمس و اربع مائہ بود[1]

سلطان محمود نے حکم دیا کہ درۂ کشمیر کے وہ تمام قلعے برباد کر دئے جائیں جو تحویل میں لائے گئے ہیں۔ فوج نے ان قلعوں سے کافی مالِ غنیمت حاصل کیا اور بہت سے غیر مسلموں کو مسلمان بنا دیا۔ اسی سال سلطان نے یہ بھی کہا کہ جو جو جگہ غیر مسلموں سے خالی ہو جائے وہاں جامع مسجدیں تعمیر کی جائیں اور علماء و مبلغین کو حکم دیا کہ وہ ہر جگہ جائیں اور ہندوؤں کو اسلامی شرائط سکھائیں خود سلطان کامیابی کیساتھ غزنین لوٹا۔ نندنہ کی یہ فتح ۴۰۵ھ میں واقع ہوئی۔

---

[1] زین الاخبار: ابو سعید عبدالحی بن الضحاک گردیزی، ترتیب و تعلیق، عبدالحی حبیبی انتشارات بنیاد فرہنگ، ایران: ص ۱۸۱

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

محمود نے ترلوچن کو شکست دی اور اسکے بعد اس دشمن کی طرف رخ کیا جس نے محمود کے خلاف ترلوچن کو کمک بہم پہنچائی تھی اور ایک باہمت کمانڈر بھیج دیا تھا۔ محمود کا یہ دشمن کشمیر کا حکمران سمگرامہ یا سنگرامہ راجہ تھا۔ جو اسوقت سلطنت کشمیر کا مقتدرِ اعلیٰ تھا۔ اب محمود نے ۴۰۶ھ (۱۰۱۵ء) میں کشمیر کا ارادہ کیا۔ وہ دریائے جہلم کے راستے آگے بڑھا اور توسہ میدان کی راہ سے قلبِ وادی میں گھسنے کی کوشش کی۔ مگر یہاں اسکا راستہ ایک مضبوط اور مستحکم قلعہ نے روک لیا اور محمود کو ایک قدم آگے بڑھنے کا موقعہ نہ دیا۔ محمود نے اپنی طرف سے یہ قلعہ پار کرنے کیلئے اپنی ساری ہمت صرف کی مگر اسکے باوجود وہ ناکام ہوا۔ پورے ایک ماہ تک اس نے قلعے کا محاصرہ کیا۔ اسی دوران موسم بدل گیا۔ برف باری اور جاڑے کی شدت نے محمود اور اس کی فوج کو سخت پریشان کیا۔ مؤرخ ابو سعید لکھتے ہیں :۔

سرمائے سخت اندر آمد و برف آمدن گرفت و جہاں یخ بند شد و از راہِ کوہ ہائے کشمیر مر آں اہل حصار مدد رسید از کشمیر وقوف یافتند۔ چوں امیر محمود رحمۃ اللہ بر آں حملہ بدید اندیشہ کرد کہ نباید کہ بر سپاہِ وے حیلتی رود و از آں قلعہ باز گشت و بصحراء بیروں آمد از آن کوہ و درہ ہا۔ چوں وقتِ بہار آمد بغزنین باز آمد۔[۵]

سخت سرما شروع ہوا۔ برف باری سے دنیا یخ بستہ ہوئی۔۔۔۔ اور اہل کشمیر کیطرف سے پہاڑوں کی جانب سے قلعہ بند لوگوں کو خوراک اور دیگر قسم کی مدد ملنی تھی۔ جب سلطان محمود نے یہ سب کچھ مشاہدہ کیا تو اُسے اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ اسکی فوج کوئی تدبیر کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ وہ فوراً قلعہ سے واپس لوٹا اور پہاڑوں اور دروں سے نکل کر میدان کیطرف آیا جب موسم بدل گیا تو غزنین کیطرف مراجعت کی۔

---

۵ زین الاخبار: ابو سعید عبدالحی بن الضحاک گردیزی، ترتیب و تعلیق، عبدالحی حبیبی انتشارات بنیاد فرہنگ، ایران ص ۱۸۱-۱۸۲

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اس طرح محمود کو محاصرہ سے دست بردار ہونا پڑا۔ ابوالقاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ واپسی پر محمود اور اس کی فوج نے راستہ کھو دیا۔ بہت سے فوجی ہلاک ہوئے۔ کہتے ہیں کہ محمود کو جملہ ہندوستانی مہموں میں سے جس مہم سے سب سے زیادہ شدائد و حوادث سے دوچار ہونا پڑا وہ یہی تسخیر کشمیر کی مہم ہے۔[1]

اِس مہم کے پورے پانچ سال بعد محمود نے ۱۰۲۱ء میں ستمبر اور اکتوبر کے وسط میں کشمیر کو اپنے تصرّف میں لانے کا پھر ارادہ کیا۔ اس دوران بھی وہی راستہ اختیار کیا جو پہلی بار اُس کی ناکامی کا باعث بن چکا تھا۔ چنانچہ اب کی بار بھی ناکام ہوا۔ پورے ایک مہینے تک قلعے سے ٹکراتا رہا مگر موسم سرما پھر شروع ہوا۔ برف باری سے تنگ آکر محمود نے محاصرہ چھوڑ دیا اور غزنین کا رُخ کیا۔ اس کے بعد اس نے کشمیر کا پھر کبھی ارادہ نہ کیا۔

اِن حملوں کے دوران محمود کو وادی میں داخل ہونے کا موقعہ نہ ملا۔ مگر یہاں ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ محمود کے ساتھ ساتھ حملوں اور یورشوں کے دوران مبلغین اسلام کی کثیر تعداد بھی ہوتی تھی جو مفتوحہ ممالک میں دعوت اسلام دیتے اور مساجد و مدارس کی تعمیر کا کام انجام دیتے تھے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی دقت لاحق نہیں ہوگی کہ اگر سلطان محمود نے سیاسی اعتبار سے کشمیر کے دشوار گزار پہاڑوں کی صعوبتوں کا شکار ہو کر اس پر قبضہ جمانے میں مکمل شکست کھائی مگر اسلام کے نقوش و اثرات چھوڑ دیئے ہوں گے

اتیچ۔ سی۔ رائے نے محمود کے حملۂ کشمیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمود اگر وادی میں داخل ہونے میں ناکام ہوا مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے جنوب کی طرف سے کشمیر کے بلند پہاڑوں کا ایک حصّہ اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ پروفیسر رائے

---

[1] تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ) حیدرآباد ۱۹۳۶ء ج ۱ ص ۸۷

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نے اپنی تائید میں ایک معاصر مؤرخ عتبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب ۱۰۱۸ء میں محمود نے قنوج پر حملہ
کرنے کا ارادہ کیا تو کشمیر کے ایک درّہ کے حاکم نے اس کی ہمرکابی اور رہنمائی کی۔[1] اس حکمران
کا نام جنکی بن شاہی تھا۔ علامہ ابن خلدون نے بھی بعینہٖ ایسا ہی نقل کیا ہے۔ علامہ موصوف
”فتح کشمیر و قنوج“ کی سرخی کے تحت لکھتے ہیں:۔

ثمّ اعتزم على غزو الهند سنة تسع پھر سلطان محمود کو ۴۰۹ھ میں ہند پر حملہ
واربع مائة. وقد كان دوّخ بلادها کرنے کا شوق لاحق ہوا جبکہ اس نے ہند کے
كلّها ولم يبق عليه الا كشمير ومن دونها تمام ممالک کو روند ڈالا تھا اور کشمیر کے بغیر کوئی
الشّعاب والمصاعب. واستنفر الناس ملک باقی نہ رہا تھا۔ کشمیر کے درمیان جنگلات اور
من جميع الجهات من المرتزقة والمتطوعة شدائد حائل تھے۔ اس نے تمام علاقوں کے لوگوں
وبثّ عساكره في أوديتها لا يعبر عن شدّتها سے کمک حاصل کی۔ محمود نے وادیوں میں فوج
جريها وبُعد أعماقها وانتهى الى كشمير بچھادی جو سخت روانی اور گہرائی کی وجہ سے ناقابل
وكان ملوك الهند في تلك الممالك تبعث عبور تھیں۔ اس زمانے میں یہاں کے حکمران اطاعت
اليه بالخدمة والطاعة وجاءه صاحب نامے محمود کے پاس بھیج رہے تھے کشمیر کا حاکم جنکی
درب كشمير وهو جنكي بن شاهي (او ساهي) بن شاہی (یا ساہی) بھی آیا۔ اس نے بھی اطاعت
فاقرّ بالطاعة وضمن دلالة الطريق وسار کی مزید برآں سلطان اور اسکی فوج کی رہنمائی کا
امام العسكر الى حصن الماهون لعشرين من کام بھی اپنے ذمے لیا۔ انہیں محفوظ قلعے کی جانب
رجب [2] پہنچایا۔ یہ ۲۰ رجب کا واقعہ ہے۔

---

1. Dynastic History of Northern India H.C. Ray = P. 137
2. کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر، بیروت ۱۹۵۶ء، القسم الاول - المجلد الرابع، ص ۷۹۶

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مؤرخ عُتبیؒ اور علّامہ ابن خلدون دونوں نے درۂ کشمیر کے راجے کا نام جنکی بن شاہی (یا ساہی) لکھا ہے جبکہ رینالڈ (RYNOLD) نے عُتبی کے تذکرہ میں "سبلی بن شابی بن بھی" اور پروفیسر محمد حبیب نے "سالی" لکھا ہے[1]۔ غرض یہ بات تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی تردد باقی نہیں رہتا ہے کہ کشمیر میں اسلام کی محمود غزنوی کے ہاتھوں ضرور بنیاد پڑی۔ ہے جو کہ آس پاس کے حدود میں اچھی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اِن حالات میں وادی کا بالکل بے اثر رہنا ناقابلِ یقین ہے عباس پرویز لکھتے ہیں کہ کشمیر کی آس پاس کی گھاٹیوں اور درّوں کے حکمرانوں اور والیوں نے سلطان محمود کی ٹری آؤ بھگت بھی کی، اس کی خدمت میں تحفے پیش کئے اور اپنی اطاعت کا اظہار کیا۔[2]

محمود کے بعد اسکے حکمران وارثوں نے بھی کئی بار قسمت آزمائی کی۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے کشمیر میں اسلام کی اشاعت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرشتہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلطان محمود کی وفات کے تین سال بعد ۴۲۴ھ میں سلطان مسعود غزنوی نے کشمیر پر حملہ کیا اور اہل کشمیر قلعہ بند ہو گئے[3]۔ عباس پرویز بھی قریب قریب ایسا ہی لکھتے ہیں :-

"سلطان مسعود درسال ۴۲۴ھ باسپاہیانِ عظیم بکشمیر رفت وقلعہ سرستی را تسخیر کرد وغنائم بسیار بدست آورد و بغزنین مراجعت کرد[4]"

سلطان مسعود نے ۴۲۴ھ میں ایک عظیم لشکر کے ساتھ کشمیر کی طرف رخ کیا اور قلعہ سرستی مسخر کیا۔ اسکے بعد بے شمار مالِ غنیمت کیساتھ غزنین کی طرف مراجعت کی۔

سلطان مسعود کے بعد سلطان مودود کی نظر بھی کشمیر پر تھی اس نے ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ھ میں اپنے لڑکے ابوالقاسم محمود کو لاہور کا حاکم اور ابوعلی کو ہند کا سپاہ سالار بنا کر بھیجا جس نے پشاور، کشمیر اور ملتان کی بغاوتیں فرو کیں[5]۔

---

[1] Mahmood of Ghaznin - P: 36 [2] تاریخ دیالمہ و غزنویاں : ص ۱-۲۵۶، ۳۳۵

[3] عرب و ہند کے تعلقات : ص ۱۰۴ [5] عہدِ اسلامی کا ہندوستان : ص ۹۳

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

حضورؔ سہسوانی

چاند نکلے گا تو عالم میں اُجالا ہوگا
پھر نہ ظلمت کا کوئی پوچھنے والا ہوگا

غیر بے چارے تو ناحق ہی ہوئے ہیں معتوب
میری پگڑی کو تو اپنوں نے اُچھالا ہوگا

ہم اگر مٹ بھی گئے عشق رہے گا باقی
کل کا عاشق کوئی ہم سے بھی جیالا ہوگا

داغ اک چھوڑ گئی ہونگی وفائیں میری
دل سے جب میری محبّت کو نکالا ہوگا

دل جوان ہے تو تصوّر بھی جوان ہے لوگو
بجھ گیا دل تو نہ یہ چاند نہ ہالا ہوگا

جس نے چاہا ہے تمہیں اسکے مقابل اک روز
دیر و کعبہ نہ کلیسا نہ شوالا ہوگا

تب کہیں جا کے حضورؔ ایک کھلا ہوگا چمن
اَن گِنت زخموں کو سینے میں جو پالا ہوگا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

عابد مناوری

آپ اپنے سے جو بچھڑوں تو یہ منظر دیکھوں
ورنہ مشکل ہے کہ خود کو ترے در پر دیکھوں

شاید آ جائے مرے ہاتھ بھی کوئی موتی
کیوں نہ اک روز سمندر میں اتر کر دیکھوں

صرف اس جرم پہ رکھا گیا پیاسا مجھ کو
میں نے چاہا تھا کہ ہر ہاتھ میں ساغر دیکھوں

گردش شام و سحر ہی کو نہ دوں صرف الزام
گھومتی ہے یہ زمیں جس پہ وہ محور دیکھوں

منتظر ہوں میں اب اس وقت کا جب اے عابد
ہر طرف اپنے سمندر ہی سمندر دیکھوں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مسعودؔ سامُوں

آخری زینہ اترتا ہے دہکتا منظر
عمرِ رفتہ میں گرفتار ہے ڈھلتا منظر

ہاں سمٹ آئے گا بیڈ روم میں بکھر رات گئے
ناامیدی میں شرابور سسکتا منظر

جوق در جوق کھنچے آتے ہیں پو پھٹتے سے
سوچتا رہتا ہے ہر شام بکھرتا منظر

صبح موسیقی میں ڈوبی ہوئی پھیلاتی ہے
مسکراتا ہوا یہ دودھ میں ڈھلتا منظر

سامنے سات سمندر پہ پھسلتی نظریں
اور پیچھے وہی خنجر سا اُترتا منظر

بھاگتے لوگ ہراساں تو نہیں ہیں شاید
جانے کیسا ہے یہ رفتار سے اُڑتا منظر

اِک نیا زاویہ اب مجھ کو ملا ہے سامونؔ
اب مری زیست یہی ڈوبتا اُگتا منظر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

راز ہناوری

اپنے سونے کی طرف پل پل اُترتا کون ہے
مجھ میں ہی صدیاں بنا کر مجھ سے ڈرتا کون ہے

بیتی صدیاں گا چلی ہیں جس کی ویرانی کے گیت
زینہ زینہ روز اس گھر میں اُترتا کون ہے

کون ہے جو چاہتا ہے مجھ سے لفظوں کا لباس
ریزہ ریزہ سوچ میں بنتا بکھرتا کون ہے

اک پرندہ کل مرے گھر سے گذرتا کہہ گیا
دھوپ میں جلتی ہوئی چھت پر اُترتا کون ہے

میں نہیں تو کون ہے چہرہ مرا پہنے ہوئے
راز میرے سامنے مجھ سا وہ مرتا کون ہے

شری کمار ورما

بارش

میں بالکونی میں کھڑی نیچے سڑک کو بارش میں بھیگتے دیکھ رہی ہوں ——

جب بھی بارش ہوتی ہے، میں سارے کام چھوڑ کر بالکونی میں آجاتی ہوں اور دس سال پہلے کا ایک خوبصورت دمکتا ہوا چہرہ میرے سامنے فضا میں مسکرانے لگتا ہے۔ میں سوچتی ہوں۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا —— سوچتا ہوگا بھی کہ نہیں۔ ان دس برسوں میں وہ نہ جانے کتنا بدل گیا ہو، میں شاید اب اُسے دیکھوں تو پہچان بھی نہ سکوں، وہ بھی مجھے شاید ہی پہچان پائے گا —— وہ جب میں اُسے ملی تھی، ملاقات کیلئے، پہچان کیلئے نہیں —— اور اس دفعہ جب میں ٹرنک سے پرانی تصویریں نکال کر دیکھ رہی تھی، عطر والے حاجی صاحب کا لڑکا آگیا تھا۔ اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک پی کر کہا تھا ——

"ایسا لگتا ہے جیسے کسی شہر پر بے تحاشا ابر برس گئے ہوں" ——

مجھے اس کی یہ بات نہ اچھی لگی تھی اور نہ بری۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ دنیا میں کچھ اچھا برا ہے ہی نہیں، جب میں حاجی صاحب کے لڑکے سے یہ کہتی ہوں تو وہ عطر کی خالی شیشی کی طرح ہو جاتا ہے اور نہایت بھونڈے پن سے مجھے نصیحت کرنے لگتا ہے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

"دیکھ ایسی باتیں نہ کیا کر۔ ان کا کوئی مطلب تو ہوتا نہیں اور یہ جینے مرنے کرنے کی باتیں ہیں بھی نہیں۔ یہ ولی، لوگوں کی باتیں ہیں اور ہم ٹھہرے معمولی دنیادار، گنہگار لوگ —" اور وہ کانوں کو چھو کر توبہ کرتا ہے — "تمہارے میرے کرنے کی باتیں — نہیں کام — نہیں وہ بھی نہیں — کچھ نہیں — تم مجھے گھٹیا عطر کی شیشیاں دیا کرو بس —" میں کہتے کہتے خاموش ہو جاتی ہوں۔ رنڈی سہی، ہوں تو عورت — اس لئے باقی باتیں نگاہوں سے سمجھاتی ہوں۔ اور وہ آنکھوں کی زبان قطعی نہیں سمجھا — وہ جسم سے آگے کچھ نہیں جانتا، کچھ نہیں سمجھتا۔ میرے ساتھ لیٹ کر وہ سمجھتا ہے کہ اس نے مجھے حاصل کر لیا۔ مجھے اس کی خوش فہمی پر ہنسی آتی ہے۔ جاتے ہوئے وہ مجھے روزے، نماز کا پابند رہنے کی ہدایت کرنا کبھی نہیں بھولتا۔

میں مسکراتی رہتی ہوں۔ روزے، نماز، گناہ و ثواب کے بارے میں، ایک مدت ہوئی، میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ یہ سب غیر ضروری لگتا ہے۔ میری ماں اور دونوں بہنیں ہر جمعرات کو پیر کی درگاہ پر چراغ جلاتی تھیں۔ میں یہ بھی نہیں کرتی۔ حاجی صاحب کے لڑکے کو یہ اچھا نہیں لگتا۔

اسے میں تب سے جانتی ہوں، جب اپنی گڑیا کے بیاہ کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ یہ گڑیا مجھے ماں یا بہنوں نے بنا کر نہیں دی تھی بلکہ سڑک پر پڑی مل گئی تھی۔ اُن دنوں وہ چوڑی دار اچکن اور رامپوری ٹوپی پہنا کرتا تھا اور بالکل گڈا سا لگتا تھا۔ اور ان دنوں لوگ میری کسی بہن کو لے کر کمرے میں بند ہو جاتے تھے۔ اور اماں سکتے تمباکو والا پان دبا کر نوٹ گنا کرتی تھی اور میں صرف حیران ہوا کرتی تھی۔ ایک رات میں نے اپنی بہنوں سے پوچھا —

"یہ لوگ ہمارے ہاں کیوں آتے ہیں —؟"

میری بہنیں کھلکھلا کر ہنس دی تھیں۔ میں نے یہی بات ماں سے پوچھی۔

"لوگ تمہیں اتنے روپے کیوں دیتے ہیں —؟"

چھالیہ کاٹتا ہوا ماں کا ہاتھ ایک دم رُک گیا۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر میری طرف یوں دیکھا تھا جیسے میرے پر نکل آئے ہوں۔ میری بڑی بہن نے برقعہ سے سر نکال کر کہا۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

"اماں! یہ ہانڈی بھی اُبلنے لگی ہے۔"

"مبارک ہو۔" چھوٹی زور سے ہنسی تھی۔

"چپ حرام زادیو۔"

گھر میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ اس رات جب میں ماں کے ساتھ سوئی تو وہ دیر تک مجھے ٹٹولتی رہی۔ اس حرکت نے مجھے بہت بدمزہ کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا۔ مجھے وہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ——

میں نے ماں، بہنوں سے بولنا کم کر دیا تھا۔ مطلب کی بات کرتی زیادہ وقت اپنی گڑیا کے ساتھ گزارتی یا بیٹھی بند دروازوں کا راز سمجھنے کی کوشش کرتی۔ مجھے لگتا کہ ماں، بہنیں اور وہاں آنے والے لوگ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں، دھوکہ دے رہے ہیں۔ ایک مرتبہ تو جذبۂ انتقام کے تحت میں نے ڈیوڑھی کا کمرہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ وہ دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتے رہے۔ ماں لوٹا لے کر اوپر گئی تھی اور آفیسر ٹی کمر کا درد لئے پڑی تھی۔ ماں نے آکر دروازہ کھولا اور مجھے خوب پیٹا، اتنا کہ مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ بڑی نے آکر بچایا اور کہا تھا۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

"وہ ہمارے گھر کیوں آتے ہیں؟"

"اس بازار میں سب کے ہی گھر آتے ہیں۔" وہ اُداس سی ہو گئی تھی۔

"یہاں انہ آیا کریں۔"

نہ جانے کیوں بڑی نے مجھے لپٹا کر خوب چوما۔ اس کی تو آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں ——

ماں مجھے پھر سرزنش کرنے گئی۔

"یہاں کوئی مجھے پیار نہیں کرتا۔ تم بھی نہیں۔" میں نے چیخ کر ماں سے کہا۔ ماں نے پورے زور سے میرے گال پر تھپڑ لگایا اور مجھے لے جا کر بستر پر جیسے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پھینک دیا اور گالیاں بکنے لگی۔ غلیظ، بے ہودہ، جیسی وہ غفورے، ساجے اور حمیدے کو دیتی ہے۔ وہ تو ہنستے رہتے ہیں۔ اس کی دیکھا دیکھی میری بہنوں کو بھی یہ عادت پڑ گئی ہے۔

موقع ملنے پر میں بہنوں کے کمروں میں گھس جاتی اور ان کا جائزہ لیتی۔ وہاں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ دوسرے کمروں کی طرح ہی تھے، پھر بھی وہ کچھ عجیب سے لگتے اور میں ان کے فرش، دیواروں، چھتوں، فرنیچر اور دروازوں کی طرف دیکھتی جو بند ہوتے ہی بے حد پُر اسرار ہو جاتے۔ وہاں سے نکل کر میں اپنی گڑیا کے ساتھ ایسی خوب صورت اور شاداب وادیوں میں نکل جاتی، جو میرے سوا کسی اور نے نہیں دیکھی تھیں۔

جب ایک دن اسی بالکونی سے میں نے ایک ڈولی دیکھی تو سوچا کہ اسی طرح میری بہنیں بھی سج دھج کر بینڈ باجوں کے ساتھ اس گھر سے رخصت ہوں۔ جب میں نے اپنے اس خیال کا اظہار ان سے کیا تو وہ ایک دم اداس ہو گئیں۔ بڑی تو اپنے بستر پر پڑی دیر تک سسکتی رہی۔ چھوٹی ایک باتصویر رسالہ لے بیٹھی۔ میں ماں کے پاس چلی گئی۔ ماں سے جب اس بارے میں بات کی تو وہ بھڑک اٹھی۔ میں کھڑکی سے حاجی صاحب کے لڑکے کو دیکھنے لگی جو کسی دولہا کی طرح سجا بنا بیٹھا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ ہماری سیڑھیوں پر نت نئے قدموں کی چاپ گونجتی رہی۔ مردوں کی جیب سے نوٹ نکل نکل کر ماں کے ہاتھوں میں پہنچتے رہے۔ بہنوں کے کمروں کے دروازے کھلتے بند ہوتے رہے۔ کچھ نہیں بدلا، مجھے تو ہر چہرہ، ہر چاپ ایک سی لگنے لگی تھی۔

ایک شام جب میں نے بڑی کے کمرے سے گالیوں کی آواز سنی اور ایک شخص کو بکواس کرتے نکلتے دیکھا اور بڑی کے چہرے پر بے زاری، تھکان اور اداسی دیکھی تو ایک دم سب کچھ مجھ پر واضح ہو گیا۔ میرے ذہن میں ایک کھڑکی پٹاک سے کھل گئی تھی اور میں نے اندھیں کمرے کمرے دیکھا کہ ایک شخص میری گڑیا کو پھاڑ کر جا رہا ہے اور چاروں طرف چیتھڑے، بکھری ہیرا اور فضا میں دم گھونٹ دینے والی گرد اُڑ رہی ہے۔ میں بے حد خوف زدہ ہو گئی۔

ماں اور بہنوں نے مجھے لے کر سرگوشیاں شروع کر دیں۔ ماں میرے زیر جامے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

غور سے دیکھتی اور مجھ سے پریشان کن سوالات پوچھتی۔ میرا حال ان دنوں اس آدمی کا سا تھا جو سوبکی شیرنی کے سامنے پڑا ہو۔ میں اپنے بدن میں عجیب سی تبدیلیاں محسوس کرنے لگی تھی۔ ارد گرد بھی لہریں اٹھتیں۔ کبھی یہ سب اچھا لگتا اور کبھی اس کے گھر آئے گی۔ اس اس طرح مجھ پر نظر رکھتی جیسے مالی بور آئے آم کے پیڑوں کی نگرانی کرتا ہے۔

ایک رات میں نے ماں اور بہنوں کو کسی امیرزادے کا ذکر کرتے سنا۔ بیچ بیچ میں میرا ذکر بھی آ جاتا۔ میں نے یہ تمام کڑیاں ملائیں اور اس طرح جو تصویر میرے ذہن میں ابھی اس کو دیکھ کر میری روح کانپ گئی۔ میرا سودا کیا جا رہا تھا۔ اس رات بھی سو نہیں سکی مجھے ماں بہنوں، ردیبوں اور امیرزادے سے نفرت ہو گئی مجھے اپنی بے بسی پر رونا آیا۔ ایک رات پھر حاجی صاحب کے لڑکے کا خیال آیا ـــــ

صبح میں نے اُسے بلایا اور صاف لفظوں میں کہا

"تم مجھ سے شادی کر لو ـــ"

"شادی، وجہ ـــ؟"

"میں کیا لڑکی نہیں ہوں۔"

"ہو" لیکن اور طرح کی ـــ شادی والی نہیں، دوسری۔"

مجھے اس پر غصہ آنا چاہئے تھا۔ اس کے بال نوچ لینے چاہئیں تھے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں سر جھکائے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شاید مجھے اس سے اسی جواب کی امید تھی۔ اُس سے کیا، اس بازار کے ہر مرد سے اسی کی امید تھی۔ لیکن یہ میں برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ میرا سودا ہو، کوئی مجھے خریدے۔ کوئی شخص مجھے حاصل کرے اور میری مرضی کے بغیر ـــ یہ توہین تھی، شکست تھی، تذلیل تھی ـــــ

ـــــ اور ایک رات جب آسمان پر بادل چھائے تھے میں گھر سے نکل آئی۔ میں جا رہی تھی ـــ کہاں، معلوم نہ تھا ـــ آپ کہیں گے خودکشی کرنے ـــ نہیں مرنے کے بجائے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

میں، میں نے کبھی نہیں سوچا تھا، یہ بھی اعتراف شکست ہوتا۔ میں تو ماں، بہنوں اور اُس بازار کو شکست دینا چاہتی تھی جو مجھے انسان نہیں سمجھتے تھے۔

ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ریلوے پلیٹ فارم پر تھی اور میرے سامنے گاڑی کھڑی تھی۔ ٹرین نے حرکت کی تو میں بغیر سوچے سمجھے سامنے والے ڈبہ میں داخل ہو گئی ——

وہ گدے دار چھوٹا سا ڈبہ تھا۔ ایک سیٹ پر ایک نوجوان کمبل لئے کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں ایک لمحہ کو خوفزدہ سی کھڑی رہی پھر جرأت کر کے دوسری سیٹ پر جا بیٹھی۔ میرے پاس نہ بستر تھا نہ دوسرا سامان، میری ساڑی بھیگ رہی تھی اور مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ نوجوان نے میری طرف دیکھا اور پڑھنا بھول گیا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں —— ؟"

"جی، اگلے سٹیشن تک،" مجھے یہ بھی تو معلوم نہیں تھا کہ گاڑی کس طرف جا رہی ہے —— "یہاں ایک سہیلی سے ملنے آئی تھی، اب گھر جا رہی ہوں۔"

وہ میرے چہرے پہ نگاہیں ٹکائے جیسے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اُس نے مجھے دری، چادر اور کمبل دیا۔ اور اپنا نائٹ سوٹ بھی۔

مردانہ سوٹ دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ بھی ہنس دیا۔ ایک دم مجھے وہ بہت اچھا لگنے لگا ——

"بدل لیجیے، سردی لگ جائے گی۔"

اس نے اتنے پیار سے کہا تھا کہ میں ٹائلٹ میں جا کر کپڑے بدل آئی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں شرما گئی۔ میرے سینے پر دوپٹہ بھی نہیں تھا۔ اس نے تولیہ میری طرف بڑھا دیا۔

ٹرین بھاگ رہی تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ نہ مجھے نیند آ رہی تھی اور نہ اُسے، ہم دونوں ایک آدھ لفظ بول کر خاموش ہو جاتے اور چھت پر لگی لائٹ کو دیکھنے لگتے ——

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اچانک اُس نے پوچھا:

"آپ کا نام۔؟"

میں نے نام بتا دیا۔ وہ پیتا رہا۔ میرا دِل زور زور سے دھڑکتا رہا۔ وہ اُٹھا، یونہی کھڑکی تک گیا۔ وہاں سے ٹائلٹ میں گیا۔ میری نگاہیں اُس کا پیچھا کر رہی تھیں ـــ نکلا تو میرے پاس آ بیٹھا ـــــ

بارش باہر ہو رہی تھی اور ٹرین میرے خون میں دوڑ رہی تھی۔ میں نے آنکھیں موندیں تو وہی شاداب وادیاں دور تک پھیلتی چلی گئیں۔ میں جانتی تھی وہ کیا چاہتا ہے۔ میں نے انکار بھی نہیں کیا۔

نہ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ تھی، نہ بند دروازوں کی پراسراریت۔ وہ دور تک، روح کی گہرائیوں تک میرے اندر سما گیا تھا اور میں خوش تھی، میں نے اُسے جیت لیا تھا۔

جب وہ اٹھ کر دوبارہ ٹائلٹ میں گیا تو میں خوش تھی۔

اگلے سٹیشن پر اُتر کر میں واپس آ گئی۔

اور اب میں اکثر بالکونی میں کھڑے ہو کر سوچتی ہوں کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ میں تو اسے اپنا محسن سمجھتی ہوں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

موہن یاور

صندلی گلی کے موڑ پر

میں نہ تو اس گلی کو بھول سکتا ہوں اور نہ ہی اس صندلی گلی کے موڑ کی حویلی کو۔ جو آج میری طرح بوڑھی ہو چکی ہے، پائمال، خستہ، ویران اور سنسان!

کل تک یہ گلی چہک اور مہک رہی تھی اور اس گلی کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ مگر وقت نے سب کچھ چھین لیا۔ وہ لمحے، وہ دن، وہ باتیں، وہ جوانی، وہ قہقہے، سب کچھ لٹ گیا۔ !!

وقت کا ایک ہی بے رحم جھونکا خوشبوؤں کے دیئے بجھا کر چلا گیا۔

میں بوڑھا ہو گیا۔

صندلی گلی بوڑھی ہو گئی

صندلی گلی کے موڑ والی صندلی حویلی بوڑھی ہو گئی۔ اور اُس حویلی کی سب سے سندر، نازک اندام کلی برف کی دیوی بن گئی۔ نوکر چاکر قصۂ پارینہ بن گئے۔ حویلی کی خوشبوئیں پھیکی پڑ گئیں۔ رنگ برنگے فانوس، قیمتی قالین، ریشمی گاؤ تکیے، شاندار حریری پردے سب لٹ گئے۔ سب مِٹ گئے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

آج صرف حویلی ہے۔

اور حویلی میں وہ پری، جو کبھی شہر میں سب سے زیادہ خوبصورت عورت تھی۔ مگر آج نہ وہ پری رہی ہے اور نہ ہی خوبصورت عورت، بلکہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ گئے گزرے حسین لمحوں کی یاد میں زندگی کی تھکی ماندی گاڑی کو دھکیل رہا ہے۔!!

وقت کسی کا نہیں ہے۔ نہ میرا، نہ تمہارا، نہ خوبصورتی کا، نہ بدصورتی کا۔ اب میں کس سے کہوں!

"اے حویلی والو۔ اب اِتراؤ۔ اب دیکھو۔ یہ شان و شوکت۔ نہ ٹھاٹ باٹ، نہ ناز و ادا۔ نہ شوخیاں، نہ خوشبوئیں، نہ قہقہے!۔"

سب کچھ ختم ہو گیا۔ وقت کے ایک ہی تھپیڑے نے سب کچھ مٹا دیا۔ سب کچھ نیست و نابود کر دیا۔

بہت پہلے—!

صدیوں پہلے—!!

یہ گلی جوان تھی، یہ حویلی جوان تھی۔ اِس حویلی سے گھنگھروؤں کی آواز نے سارا شہر پاگل سا کر رکھا تھا۔ سارا شہر دیوانہ تھا۔ صرف اِس گلی کا— اسی حویلی کا—

شہر کے رئیس زادوں نے اپنا سب کچھ اسی حویلی میں، طبلے کی تھاپ اور خوبصورت لچکتی کمر پر نثار کر دیا تھا۔ وہ گھنگھروؤں کی آواز— وہ عطرِ چنبیلی کی خوشبوئیں۔ وہ مدمست شباب۔ وہ اٹھکیھلیاں۔ وہ پسینے میں شرابور ننگی باہیں۔

حویلی کے پچاس کمرے تھے۔

اور ہر کمرے کی اپنی ایک داستان تھی۔

اور مجرے کی محفل پھولوں میں ڈوبے ہوئے بڑے ہال میں سجتی تھی۔ بڑا کمرہ جو سج دھج کے لحاظ سے راجہ اندر کا دربار لگتا تھا۔ جیسے انگوٹھی میں نگینہ—!!

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

حویلی، ایک داستان،

پچاس برس ــــ پچاس داستانیں!!

صندلی گلی ــــ بھولی بسری کہانی

اور میں ــــ خود ایک صفر۔۔!!!

"اس گلی میں مت جاؤ۔۔"

ایک گرجدار آواز ابھرتی۔

"جاؤں گا۔۔"

"کیوں جاؤ گے۔۔!"

"جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ اس حویلی سے ڈر کیسا۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں اس حویلی میں ضرور جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا"

ــــ اور میں نے اپنے گھر والوں کی پرواہ نہیں کی۔ انکی بات تک نہیں مانی۔ اور اپنا سب کچھ اسی حویلی کی نذر کر دیا۔ پہلے اپنا۔ پھر گھر والوں کا۔ میرے مکان، میرے زیورات سرسراتے ہوئے نوٹ، سب کچھ اسی حویلی میں چلا گیا۔

سارا شہر اسی حویلی میں سمٹ گیا۔

یہ حویلی تھی یا بھوت بنگلہ!!

موتیے کے ہار، گلاب کے پھول، مولسری کی کلیاں، اس حویلی میں ایسے نظر آتیں، جیسے یہ حویلی نہیں ہے بلکہ ایک باغ ہو۔ پھولوں کا، خوشبوؤں کا۔ رنگوں کا!

گھنگھروؤں کی جھنکار پر پارساؤں کے دل دھک سے رہ جاتے!

صندلی گلی۔ خوبصورت چہرے، مرمریں جسم، لچکتے، جھومتے، ناچتے لوگ!

مگر اب کچھ بھی نہیں رہا۔

گلی وہی ہے۔ حویلی وہی ہے۔ مگر وہ لوگ نہیں رہے۔ وہ گھنگھرو نہیں رہے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

وہ تھرکتے ہوئے پاؤں نہیں رہے۔ وہ لے نہیں رہی۔

سب کچھ مٹ گیا۔ ساری حویلی سنسان ہوگئی۔ پنجرہ ٹوٹ گیا۔ سب چڑیاں پھڑ پھڑا کر اڑ گئیں۔ مگر ایک چڑیا پنجرے میں ہی رہی۔ اڑنے کیلئے پھڑ پھڑاتی مگر اٹھنے سے لاچار۔! ہمت ہار کے بیٹھ گئی۔

صندلی گلی کی رنگت اڑ گئی۔ حویلی کی رنگت اڑ گئی۔ چہرے کی رنگت اڑ گئی۔ سب کمرے ویران ہو گئے تھے۔ گھنگھروؤں کی آواز میں وہ دم خم نہ رہا تھا۔ کانپتے جسم کا بوڑھا ناچ کون دیکھے۔ نوکر چاکر بھی کھسک گئے۔ جیسے جوانی بھاگ گئی ویسے ہی چاہنے والے بھی بھاگ گئے۔

پچکا ہوا سنہ۔ سفید بال، جیسے برف۔ اندھی آنکھیں، جھکی ہوئی کمر۔ بھنبھناتی مکھیاں! گھنگھرو بے جان۔ فانوس غائب، قالین ندارد۔ حریری پردے پھٹ چکے تھے اور انکی رنگت تک اڑ چکی تھی۔

صرف پچاس برس میں اس حویلی کی قسمت میں اندھیرا کہاں سے آگیا۔ روشنی کون ہتھیا کرلے لیا۔ کس کی نظر کھا گئی اس حویلی کو۔

"سب خوبصورتی کے پجاری ہیں۔ جب بدصورت ہو جاؤ گے تو پھر دیکھنا، کون آئے گا، پھولوں اور نوٹوں کی مالائیں لے کر۔"

آج پچاس برس کے بعد میرے قدم اُسی گلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہی گلی ہے، وہی حویلی ہے۔ مگر حویلی کے دربان نہیں۔ وہ خادمائیں نہیں۔ وہ عطر پھلیل کے فوارے نہیں۔

میں حویلی میں داخل ہو چکا ہوں۔ ہر طرف غلاظت، کوڑا کرکٹ بدبو، ناچ رہی ہے۔

"وہ خوشبوئیں کہاں کھو گئیں۔ وہ چہرے کہاں چھپ گئے۔ جن کی تابناکی اور چمک دمک کے سامنے چاند بھی شرما جاتا تھا۔"

ایک کمرے میں پلنگ پر ایک بڑھیا لیٹی ہوئی کھانس رہی تھی۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

"کون ہے ——"

"میں —— میں۔ —"

"میں کون ——"

"رام پرشاد سکسینہ......"

"اچھا سیٹھ رام پرشاد ——"

"ہاں —— سیٹھ رام پرشاد — مگر اب صرف رام پرشاد رہ گیا ہوں"، میں نے کہا۔
اس نے کھانستے ہوئے کہا — "سیٹھ جی — اب آپ یہاں کیسے آئے۔ اب تو یہاں کچھ ہی نہیں رہا۔ نہ وہ چہرے، نہ وہ گھنگھرو، نہ وہ طبلے، نہ وہ قالین، نہ پردے، نہ ناچنے والے، اور نہ ہی داد دینے والے۔"

"مگر — میں تو صرف تمہیں دیکھنے آیا تھا اپنے حسین ماضی کو، یہ لو۔ یہ دیکھو۔ میں تمہارے لئے یہ موتئے کا ہار لایا ہوں۔"

"سیٹھ جی — میں نے موتئے کی خوشبو ہی سے پہچان لیا تھا کہ یہ کوئی پرانا چاہنے والا آیا ہے۔ مگر اب یہ موتئے کا ہار میرا دل نہیں بہلا سکتا۔ ایک کام کرنا —— میری چتا پر دنیا بھر کی خوشبوئیں، پھول، گھنگھرو چڑھا دینا۔ تاکہ یہ میرے ساتھ ہی جل جائیں —— یہی میری آخری خواہش ہے ——"

میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے —— اور وہ برابر کھانستی رہی۔!!

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کشوری منچندہ

یادوں کا دھواں

میں جب بھی کبھی اسے دیکھتا ہوں، میرے ذہن پر یادوں کے سائے لہرانے لگتے ہیں تلخ و شیریں یادوں کے سائے۔ یہ یادیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ یادیں جو ہونٹوں پہ ہلکی سی تحریر کھینچ دیتی ہیں۔ یادیں، جو قہقہوں کی صورت میں پھوٹ پڑتی ہیں۔ اور فضا میں ہلچل سی مچا دیتی ہیں۔ یادیں، جو دل و جگر کو چیرتے ہوئے آنکھوں کو بھگو دیتی ہیں اور انسان کو آہ و بکا پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ایسی ہی میٹھی اور کڑوی یادوں کے سہارے وہ مجسم ہو کر میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور دوستانہ انداز میں میری طرف دیکھتا ہے تو پُر خلوص مسکراہٹ سے اسکا چہرہ جگمگا اٹھتا ہے۔ اسکا فراخ سینہ اور بھی چوڑا ہو جاتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر اپنائیت بھرے جذبے سے میرا دایاں ہاتھ تھام لیتا ہے۔ میں خوش ہو جاتا ہوں اور پیار بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا ہوں لیکن اسکے چند لمحوں بعد ہی ایک اور چہرہ نہ جانے کہاں سے میری نظروں کے اُفق پہ نمودار ہو جاتا ہے جیسے دیکھ کر میرے احساس میں تلخیاں سی ابھر جاتی ہیں۔ گُذرے ہوئے ایام میں کئی مرتبہ میں نے اسے پہچان کر بھی نہیں پہچانا ہے۔ ہر بار اس پہ ایک سرسری نگاہ ڈالکر آگے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بڑھ گیا ہوں لیکن اب تو اسے پہچاننا ہی پڑے گا، کیونکہ یہ چہرہ بھی تو اسی کا ہے۔ اس چہرے کی آنکھوں میں نہ تو وہ شعلہ چمک رہی ہے اور نہ ہی ہونٹوں پہ وہ پُر خلوص مسکراہٹ۔ اس کے بجائے اس کی آنکھوں میں غرور و تکبّر کا غبار اور ہونٹوں پہ زہر میں بجھی ہوئی طنز یہ مسکراہٹ کی دھند چھائی ہوئی ہے جو چند لمحوں بعد نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے اور اس چہرے پہ پشیمانی اور درد و کرب کے تاثرات حاوی ہو جاتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میرے دل پہ ایک چوٹ سی لگتی ہے اور اس چوٹ کی کسک سے گھبرا کر میں جلد ہی اُسے یادوں کے دامن سے جھٹک دیتا ہوں۔ پھر اس وجود کا تصور کرنے لگتا ہوں جسے میں نے کل صبح تھکے تھکے قدموں سے ایک بڑے ناشر کی دکان سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس کے سارے کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ جسم کمزور اور دبلا ہو چکا تھا اور وہ ہونٹوں پہ بار بار زبان پھیرے جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پیاس اس کے ہونٹوں پہ چپک کر رہ گئی ہے۔ جب وہ آگے بڑھا تو خود کو اسطرح بچا بچا کر چل رہا تھا جیسے سڑک پہ کسی سے ٹکرا جانے پر اسے اپنے وجود کے ٹوٹ پھوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔

تب اس کی قابل رحم حالت کا خیال کر کے مجھے برسوں پہلے کی ملاقات یاد آ گئی جب وہ مجھے اردو کالج کے چکری دار گیٹ پہ ملا تھا۔ اسوقت وہ بہت ہی خوبصورت اور صحت مند نوجوان نظر آ رہا تھا۔ اُسکے بھرے بھرے گالوں پہ سرخی اور آنکھوں میں اطمینان و مسرت کے چراغ جل رہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک خوبصورت سی کتاب تھی۔ اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے چوڑے ماتھے پہ آئی ہوئی سیاہ بالوں کی لٹ کو پھر سے بالوں میں جمانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہر بار وہ پھسل کر اس کے فراخ ماتھے پہ ایک ناگن کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس چکر میں جب وہ چکری سے نکلنے لگا تو کتاب اس کے ہاتھ سے پھسل کر دھرتی پہ گر پڑی۔ تب بالوں سے کھیلتا ہوا اسکا ہاتھ بے اختیار نیچے آ گیا تھا اور وہ لٹ پھر سے اس کے ماتھے کو چومنے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ایک شرارت بھری مسکان دوڑ گئی جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک قہقہے میں بدل گئی اور اسی دوران طنز یہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کتاب اٹھاکر میں نے جلدی سے اسکے ہاتھ میں دے دی۔ اسوقت مجھے ایسا لگا جیسے شکریہ کے طور پر اس نے چند الفاظ کہے تو ہیں مگر میں انہیں سن نہیں پایا۔ کتاب اس نے چکری پہ رکھدی اور جیب سے رومال نکالکر اُسے اس طرح جھاڑنے پونچھنے لگا جیسے کوئی ماں دُھول اور مٹی میں کھیلتے ہوئے بچّے کو پہلے تو بڑے پیار سے صاف کرتی ہے، پھر چٹاخ پٹاخ بوسوں سے اسکا مُنہ لال کر دیتی ہے۔

ابھی اس نے کتاب سے مٹی صاف کی ہی تھی کہ اچانک ہی کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پہ اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھدیا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا، اس سلونے ہاتھ کی لمبی لمبی انگلیوں میں دو خوبصورت انگوٹھیاں سجی تھیں اور بڑے بڑے ناخن جلد کے رنگ کی نیل پالش سے چمک رہے تھے۔

"اوہو ــ ! تو آپ ہیں ــ !" اس نے ہاتھ کی بناوٹ اور نیل پالش کے انتخاب سے ہی اس ہستی کی شخصیت کا اندازہ کرلیا تھا۔ تب مجھے لگا کہ اب میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہ ہوگا۔ اسلئے اس سے ہاتھ ملاکر اپنی راہ چل دیا۔

ـ دوسری بار وہ مجھے کافی ہاؤس میں ملا تھا، جہاں میں کافی کا پیالہ ہونٹوں سے لگائے سوچتی نگاہوں سے ایک خوبصورت لڑکی کو ایک بدصورت لڑکے سے راز و نیاز کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسکے وہاں آنے کا علم مجھے اسوقت ہوا جب وہ مجھے ایک ٹھوکر مارتے ہوئے میرے سامنے والی خالی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا" اوہو...... تم ..... !" میں نے پیالہ ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ پھر اسے سبز رنگ کے سن مائیکا کے میز پر رکھتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ اسکی طرف بڑھادیا تھا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں لیکر پہلے تو ہونٹوں سے لگالیا، پھر اسے گود میں رکھتے ہوئے کہنے لگا "میں آپ ہی کو تلاش کر رہا تھا۔ ایک خوشخبری سنانے کیلئے ــ" اور یہ کہتے ہوئے اس نے نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

"زہے نصیب۔ آپ جیسا عظیم فنکار اور میری تلاش کرے۔ کہیئے کیا خوشخبری ہے؟"
میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور میز پہ رکھا کافی کا پیالہ ہونٹوں سے لگاتے ہی خالی کر کے پھر سے میز پہ رکھ دیا۔ پھر جیب سے رومال نکالا، ہونٹوں کو صاف کیا اور اُسے پھر جیب کے حوالے کر دیا ـــ

"میں شادی کرنے جا رہا ہوں۔" اس نے اس طرح درد بھرے لہجے میں کہا جیسے وہ شادی کرنے نہیں بلکہ موت کو گلے لگانے جا رہا ہے لیکن میں اسے مبارکباد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

"میری طرف سے خوشیوں بھری مبارکباد قبول فرمائیے۔ اور ہاں یہ تو بتائیے کہ وہ خوش نصیب لڑکی کون سی ہے جسے آپ شریکِ زندگی بنانے جا رہے ہیں ـــ؟"
اور یہ کہتے ہی مجھے وہ سانولا سلونا ہاتھ یاد آگیا، جو میں نے پہلی ملاقات میں دیکھا تھا اور اس ہاتھ کے نگاہوں کے افق پہ اُبھرتے ہی میں اُس لڑکی کے سراپا کا تصوّر کرنے لگا۔
"میں اسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، جسکا ہاتھ آپ نے اس دن دیکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ اردو کالج میں لیکچرار ہے۔ میری اور اس کی محبت کا آغاز ایک مشاعرے میں ہوا تھا جہاں میں ایک غزل پڑھ رہا تھا اور وہ مجھے بے تحاشہ داد دیئے جا رہی تھی۔ اس مشاعرہ کے بعد سے ہی میری توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی تھی اور اس کی ذات کے کتنے ہی حسین گوشے میری نظروں میں اُجاگر ہوتے چلے گئے تھے، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس سے ٹوٹ کر محبّت کرنے لگا۔ وہ بھی مجھ سے والہانہ محبّت کرتی ہے اور اس کی محبّت کے طفیل ہی، ہوفت میں فنی بلندیوں پر پرواز کر رہا ہوں۔ وہ میرے گیتوں کی جان اور غزلوں کی شان ہے۔ وہ میری کہانیوں کی روح رواں اور خیالات کی اڑان ہے۔ وہ مجھے نئے نئے نکتے سمجھاتی ہے اور نئے نئے خیالات سے روشناس کراتی ہے۔ اُسکے ہاتھ اتنے خوبصورت ہیں اور وہ اتنی حسین تصویریں بناتی ہے۔ اور اتنی شاندار کڑھائی کرتی ہے کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھتے ہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پھر میں انہی تصویروں کی روح کو الفاظ کا جامہ پہنا کر کہانی، غزل اور گیت کے قالب میں ڈھال دیتا ہوں ——" اور یہ کہتے ہوئے وہ خلاؤں میں نہ جانے کیا کیا تلاش کرنے لگا۔

" واہ ـ واہ ـ کیا شاندار لڑکی ہے ـ اگر میں شادی شدہ نہ ہوتا تو جھٹ سے اسکے باپ کو شادی کا پیغام دے ڈالتا ـ ارے صاحب! آپ سوچ کیا رہے ہیں، فوراً اس لڑکی سے شادی کر ڈالئے اور ایک ایسے خوبصورت بچے کو جنم دیجیے، جو آپ دونوں کی روح میں سمویا ہوا حسن و فن لیکر پیدا ہوا اور اس خوبصورت دنیا کو اور بھی حسین بنا دے ——"

" آہا ـ کتنی خوبصورت بات کہی ہے آپ نے ـ کاش! میرا لکھپتی باپ بھی ایسی ہی بات کہہ سکتا اور مجھے اس سے شادی کی اجازت دے دیتا ـ وہ مجھے ایک چپراسی کی کالے رنگ والی لڑکی سے شادی کی اجازت ہرگز نہیں دیگا ـ اس کے نزدیک ایک چپراسی کی لڑکی جب اس کے گھر بہو بن کر آئے گی تو اس کی ناک کٹ جائے گی ـ لوگ اس کے منہ پر تھوکیں گے اور وہ سماج میں کہیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہیگا ـ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے یہ دھمکی بھی دے رکھی ہے کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی اور اس لڑکی کا خیال چھوڑ کر اسی کی طرح کے ایک سرمایہ دار کی گوری چٹی لڑکی سے شادی نہ کی تو وہ مجھے جائداد سے عاق کر دیگا اور تمام مکانات، ملیں اور نقد روپیہ میرے چھوٹے بھائی کے نام کر دیگا ـ !!"

" ارے واہ، میرے دوست! بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ بنا دیا ـ ایسی باتوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے، یہ باپ لوگ ایسا ہی کہتے ہیں ـ جائداد کے چھن جانے کے ڈر سے ایسی فنکار بیوی کو چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے، اجی صاحب! آپ کے پاس تو چار خوبصورت ہاتھ ہیں ـ دو آپ کے اور دو آپ کی محبوبہ کے ـ اس پر بھی آپ اتنے غمگین اور اداس ہیں ـ آپکو چاہیئے کہ آپ کی دولت کو ٹھوکر مارتے ہوئے اس لڑکی سے شادی کر لیں ـ آپ کیلئے دس بیس ہزار کی بات ہی کیا ہے ـ آپ دونوں کے پاس جو فن ہے، آرٹ ہے ـ اس سے آپ لاکھوں کما سکتے ہیں اور ملک و سماج کو ایک نئی راہ دکھا سکتے ہیں ـ اس لئے آپ کو

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بطور ایک ادیب و شاعر کے عوام کو ایک نئی راہ دکھاتے ہوئے اپنے سماجی رتبہ اور ذات پات کا خیال کئے بغیر غریب چپراسی کی اس فنکار بیٹی سے شادی کر کے ایک مثال قائم کر دینی چاہیئے ۔۔۔ " یہ کہہ کر میں نے نگاہیں اس کے چہرے پہ جما دیں اور اس کے چہرے پر ابھرنے اور مٹنے والے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ اُسکے چہرے پر کتنے ہی رنگ آئے اور گذر گئے ۔۔۔ پھر وہ اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے چپ چاپ کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا تھا۔

تیسری بار وہ مجھے نریش سنیما میں ملا تھا۔ اس بار وہ اکیلا نہیں تھا۔ اسکے ساتھ پچیس تیس برس کی ایک صحت مند اور خوبصورت عورت بھی تھی۔ جس کی گود میں گول گول گالوں والا ایک صحت مند بچہ ہمک رہا تھا۔ اس عورت کے چہرے پہ کچھ ایسی دلکشی و کشش تھی کہ ایک بار دیکھنے کے بعد بار بار دیکھنے کی خواہش ہوتی تھی۔ جب میری نگاہیں اس کے چہرے پہ پڑیں تو اس کی نیلی آنکھوں اور مکھن کی طرح چکنے چکنے گالوں میں کچھ ایسی جذب ہو گئیں کہ میں باوجود کوشش کے بھی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹا نہیں سکا، سحر زدہ سا اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ میری محویت کو دیکھکر وہ بڑے غرور و تکبّر سے قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔ " دیکھا۔ اسے کہتے ہیں حسن۔ مسحور کن اور سحر طراز حُسن ۔۔ تم تو مجھے غریب چپراسی کی اس کالی کلوٹی لڑکی سے شادی کرنے کی صلاح دے رہے تھے اور سماج کو راستہ دکھانے کیلئے مثال قائم کرنے کیلئے کہہ رہے تھے۔ ارے یہ غریب لوگ تو صرف کھلونا ہیں، کھیلنے کیلئے اور ٹوٹ جانے پر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دینے کیلئے۔ شادیاں تو آخر سرمایہ داروں کی لڑکیوں سے ہی کرنی ہوتی ہیں جو ہمارے خاندانی وقار کو مزید بلند کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ اب تم نے اپنی آنکھوں سے میری بیوی کو دیکھ لیا ہے اور اس کے حُسن لازوال سے متاثر بھی ہوئے ہو۔ اسے ہی تو کہتے ہیں مثال بے پناہ حُسن کی مثال ۔۔ !! " یہ کہتے ہوئے اسکی آنکھوں میں غرور و تکبّر کا غبار اور ہونٹوں پہ ایک زہریلی مسکراہٹ بکھر گئی جو بعد میں حقارت بھرا قہقہہ بن کر مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ اس قہقہے کا زہر میرے کانوں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

میں ٹپکتے ہی میری نگاہیں بے اختیار اس خوبصورت عورت کے بدصورت ہاتھوں پہ جم گئیں۔ اس کے ہاتھ بہت چھوٹے اور بھدے تھے۔ موٹی موٹی انگلیوں کے سروں پر گہرے سرخ رنگ کی نیل پالش لگی تھی جو اس کی بدذوقی کا کھلا اظہار تھی۔ یہ سب دیکھ کر مجھے اس لیکچرار کی حسین و فنکارانہ انگلیاں یاد آگئیں جنہوں نے میرے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ بکھرادی اور میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ نظریں چار ہوتے ہی اس کے قہقہے کی موت ہوگئی اور وہ چہکتے چہکتے اس طرح خاموش ہوگیا جیسے کوئی رنگین غبارہ ہوا نکل جانے پر ٹھُس ہوکر رہ جاتا ہے۔ اس نے جلدی سے نظریں گھما لیں اور مجھ سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ عین اسی وقت اوباش قسم کے چند نوجوان ہمارے پاس آگئے اور اس کی غزلوں کا حوالہ دے دے کر اسکی تعریفیں کرنے لگے۔ اس نے موقعہ غنیمت جانا اور مجھے قصداً نظرانداز کرکے اُن سے اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے وہ اسکے سگے سمبندھی ہوں۔

چوتھی اور آخری بار وہ مجھے ایک آل انڈیا مشاعرہ میں ملا تھا جہاں وہ سٹیج پر کھڑا بڑے دلکش انداز میں ایک المیہ گیت گا رہا تھا۔ اس کی کنپٹیاں سفید ہوچکی تھیں اور بالوں میں چاندی کے تاروں کی کثرت ہوچکی تھی۔ گالوں کی سرخی اڑ چکی تھی اور جسم میں ڈھیلا پن پیدا ہوچکا تھا لیکن اسکے گیت نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ اس کی خوبصورت اور دل میں اتر جانے والی آواز احساسات میں اتھل پتھل مچائے جارہی تھی جسکی وجہ سے کتنی ہی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی پھسل پھسل کر گالوں پہ لڑھکنے لگے تھے۔ اس کا درد بھرا نغمہ سن کر میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں اور اس کی آواز کے زیر و بم پر تھرکتے ہوئے میں بے اختیار یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ وقت اور زمانے نے اس پر نہ جانے کتنے ظلم وستم ڈھائے ہوں گے جو وہ اس درجہ حساس اور دکھی ہوگیا ہے کہ اس کی آواز میں اس بلا کا درد سمٹ آیا ہے۔ پروگرام ختم ہوا تو بہت سے لوگ جن میں جوان لڑکے،

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

لڑکیاں اور ادھیڑ عمر، بھی طرح کے لوگ شامل تھے، آٹو گراف لینے کیلئے اس کی طرف دوڑ پڑے۔ ان سب نے اسے گھیرے میں لے لیا اور تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنی اپنی آٹو گراف بکس اسکی طرف بڑھادیں۔ آٹو گراف بکس پہ ایک فاخرانہ نظر ڈالتے ہوئے جب وہ پچھلی جیب سے قلم نکالنے لگا تو اچانک ہی اسکا چہرہ زرد ہوگیا اور بوکھلا کر اپنی تمام جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اسکا قلم شاید کہیں گر گیا تھا یا کسی کو اس ادیب وشاعر اور گیت کار کے قلم پر اتنا پیار آگیا تھا کہ وہ اسے اڑائے بغیر نہ رہ سکا۔ چند لمحوں تک جب وہ اسی طرح ہاتھ چلاتا رہا تو اس کی بوکھلاہٹ اور پریشانی پہ مجھے ترس آگیا اور میں نے جھٹ سے اپنا قلم نکالکر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرادیا۔ قلم دیکھتے ہی وہ بچوں کی طرح خوش ہوگیا اور اس کے ہونٹوں پر تشکر آمیز پر خلوص مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرا قلم اُسکے ہاتھ کی گرفت میں چلا گیا اور آٹو گراف بکس کے چکنے کاغذ پہ پھسلنے لگا۔

چند لمحوں بعد بھیڑ چھٹ گئی اور اس کے چاہنے والے اُسے اکیلا چھوڑ گئے لیکن میں اب بھی وہیں کھڑا تھا اور اسکے چہرے پہ ابھرنے اور مٹنے والے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ خیالوں میں گم رہا۔ اور اس کے چہرے پہ اُکتاہٹ، تاسف اور بیزاری کے تاثرات ابھر ابھر کر مٹتے رہے۔ پھر اچانک ہی اس نے میرا قلم واپس کردیا اور سرد آہ بھر کر کہنے لگا۔ "آپ اسوقت یقیناً میرے بارے میں یہی سوچ رہے ہوں گے کہ کتنا شاندار آدمی ہے۔ جسکو سننے کیلئے اتنے ڈھیر سارے لوگ آئے ہوئے تھے اور جسے کتنے ہی لوگوں نے آٹو گراف لینے کیلئے گھیر رکھا تھا۔ آپ شاید اسے کچھ اہمیت دیتے ہوں لیکن مجھے یہ سب بیکار سا لگتا ہے۔ مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ملتی اور نہ ہی مجھے یہ دل کا سکون دے سکتے ہیں۔ کاش! اسوقت میں آپ کی بات مان جاتا اور ان خوبصورت اور فنکار ہاتھوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا تو آج مجھے اتنا پشیمان اور دکھی نہ ہونا پڑتا۔ آپکو شاید معلوم نہیں کہ میری وہ بیوی جس کے حُسن پر میں فخر وغرور سے اتراتا پھرتا تھا اور کسی دوسرے کو خاطر میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہی نہ لاتا تھا، بے وفا نکلی اور آپکا کہنا سچ نکلا کہ خوبصورتی سے بدصورتی زیادہ حسین ہوتی ہے، وفادار ہوتی ہے۔ وہ خوبصورت تھی نا، اسی لئے ہزاروں روپیہ نقد اور تمام زیورات لیکر نہ جانے کس کے ساتھ بھاگ نکلی ــ اور تو اور، وہ گول مٹول گالوں والا خوبصورت بچّہ بھی نہ جانے کس کا تھا ـــــ !!

اور یہ سب کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، جنہیں اس نے فوراً ہی رومال میں جذب کر لیا لیکن وہ پشیمانی اور شرمندگی کے احساس کو، باوجود کوشش کے بھی، اپنے وجود سے جھٹک نہیں سکا۔ اسکا سر جھک گیا اور رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے تھکے تھکے قدموں سے ڈائیس کی طرف چلا گیا تھا۔ جہاں مشاعرہ کے منتظمین اس کا انتظار کر رہے تھے اور تب وہ ان کی بھیڑ میں کھو گیا تھا۔ اور آج جبکہ میں یادوں کے دھوئیں میں بری طرح گھر گیا ہوں، اس کی شخصیت اور کردار کے تمام پہلو اندھیری رات میں چمکتے ہوئے روشن ستاروں کی طرح میرے ذہن کے آسمان پر جگمگا رہے ہیں اور میں اس کی اپنی اور دنیا والوں کی پُر فریب ذہنیت، غرور و تکبّر، بے وفائی اور ناقدر شناسی کا ماتم کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں ـــــــ ....

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

میری نظر میں

(تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

کتاب کا نام	صنم تراش
مصنف	صلاح الدین نیّر
سائیز	۱۸×۲۲/۸
ضخامت	۱۳۶ صفحات
کاغذ	اعلیٰ
قیمت	۱۲ روپے
ناشر	نیشنل بکڈپو مچھلی کمان۔ حیدرآباد

"صنم تراش" نیّر کی شعری تخلیقات کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے سے پہلے ان کے دو اور شعری مجموعے "گلِ تازہ" اور "زخموں کے گلاب" شائع ہو چکے ہیں۔ نیّر کا شمار جنوبی ہند کے اُن شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو ادب میں اپنے لئے ایک مستقل جگہ بنالی ہے۔ اُن کا کلام ہند و پاک کے ادبی جرائد میں برابر چھپتا رہتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ نیّر کی شاعرانہ صلاحیت کو سب لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے اُنکی شاعری کو اردو شاعری کی ایک منفرد آواز قرار دیا ہے، حق بھی یہی ہے کہ مسلسل کاوش سے انہوں نے اپنی شاعری کو ایک الگ انداز عطا کیا ہے۔ "گلِ تازہ" نیّر کی شاعری میں ایک علامت بن کر ابھر آیا ہے۔ گلِ تازہ کی علامت نے نیّر کی شاعری کو بقول ڈاکٹر راج بہادر گوڑ "وہ مقام عشق عطا کیا ہے۔ جو اس کی شاعری کی روح ہے۔" "گلِ تازہ" والی علامت کو ان کی شاعری میں ابھی بھرپور طریقے پر ابھرنا ہے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مگراُن کی شاعری میں اس گُل کی بھینی بھینی خوشبو مہکتی نظر آتی ہے ؎

کیسے کیسے پھول دیکھے ہم نے گلشن میں مگر

اُس "گلِ تازہ" کی خوشبو کے سوا کیا یاد ہے

ہم تو صحرا نصیب ہی ٹھہرے

تیرا کیا ہو گا اے "گُلِ تازہ"

"صنم تراش" کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ اچھی طرح ہوتا ہے کہ مصنف میں بھرپور شاعرانہ صلاحیتیں موجود ہیں مگر ابھی اُن کے شعری تجربات کو تفکر کی بھٹی کی آنچ میں سونے سے کندن ہونا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ نیّرؔ بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے کیوں کہ زیرِ نظر مجموعے میں نظموں کے مقابلے میں غزلوں کا پلڑا بھاری ہے۔ نیّرؔ کی غزلیں روایت اور بغاوت کی آئینہ دار ہیں۔ مگر ان غزلوں میں روایت کی پاسداری کے یہ معنی نہیں لئے جاسکتے کہ انہوں نے اپنی راہ کا الگ سے تعیّن نہیں کیا ہے۔ نیّرؔ کے انفرادی اندازِ بیان کو سمجھنے کے لئے ان کی شاعری کا مطالعہ ہی قاری کی مدد کر سکتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس نے اپنے وارداتِ قلبی کا اظہار کرتے ہوئے بھی غزل کی زبان کا خیال رکھا ہے۔ نیّرؔ نے جدیدیت اور قدامت، دونوں میں سے کسی ایک سے بھی اپنا ناطہ نہیں توڑا ہے مگر اپنی بات کو اپنے انداز میں کہنے کی بھرپور سعی کی ہے جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں ؎

اپنے ہی جیسا شہر میں اک اور شخص تھا

کیا جانے کس کے سوگ میں بازار بند ہیں

پھولوں کے جسم سے بھی اُترنے لگا لباس

شائد یہ جشنِ گُل کا نیا اہتمام ہے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کیا بے بسی ہے سایۂ دیوار بھی نہیں
ہم لوگ عمر سے ایسے گھروں میں ہیں

مفہوم میرے خط کا سیاہی نگل گئی
جب لفظ خشک ہوگئے تحریر جل گئی

ایک، دو پل نہیں صدیوں سے اسی حال میں ہیں
کون سا درد لئے پھرتی ہیں گھر گھر آنکھیں

اس لئے چپ ہیں کہ تم کو ہی ندامت ہوگی
زندگی کیسے بسر ہوتی ہے پوچھا نہ کرو

جب قتل کا الزام کسی اور کے سر ہے
پھر کس لئے اس لاش سے تم دور کھڑے ہو

نیرؔ کی نظموں میں بھی ایک شگفتگی ہے۔ تنہائی کا کرب اس کو گھن کی طرح کھائے جارہا ہے۔ آج کے انسان کو بھری محفل میں اکیلے پن کا سانپ ڈسے جارہا ہے۔ تنہائی کا یہ احساس آج کل کے حساس انسان کی قسمت بن گیا ہے۔ نیرؔ جیسا حساس شخص کس طرح اپنے آپ کو اس درد و کرب سے الگ رکھ سکتا ہے ؎

سوائے غم
کوئی زادِ سفر نہیں میرا
سوائے دردِ مسلسل
ملا بھی کیا مجھ کو
یہ غم کے آنسو
مری نامراد پلکوں پر
نہ جانے کونسی راہوں میں چھوڑ جائیں گے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہزار لوگوں میں رہ کر بھی کتنا تنہا ہوں

تمہارے ایک نہ ہونے سے بے سہارا ہوں (زادِ سفر)

تمہیں تو ہوگا مری تشنگی کا اندازہ

سُلگ رہے تھے دِل و جان

مگر دُھواں نہ اُٹھا

نظر کے سامنے ایک روشنی کا دریا تھا

میں بدنصیب ایک بوند بھی تو پی نہ سکا (سہارا)

"صنم تراش" ایک اچھا شعری مجموعہ ہے۔ سادہ مگر خوب صورت گرد و پوش اور جلد کے ساتھ اس مجموعے کی قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے ــــ ••

کتاب کا نام:۔ **مغربی بنگال میں اردو کا سفر**

مصنف:۔ ایم۔ اے۔ نظر، سائز:۔ $\frac{20\times30}{8}$، ضخامت:۔ ۸۰ صفحات، قیمت:۔ ۱۵ روپے، ناشر:۔ وارثی پبلیکیشنز، کلکتہ

اردو کی نشو و نما میں ملک کے مختلف علاقوں میں جو کام ہوا ہے اس کے بارے میں لکھنا ایک دِقت طلب معاملہ ہے۔ ایم۔ اے۔ نظر صاحب نے بنگال میں اردو کی نشو و نما کے بارے میں قلم اٹھا کر اچھا ہی کیا ہے مگر ان کی سہل انگاری کی وجہ سے معاملہ کسی ٹھکانے نہیں لگا ہے۔ اس کتاب کو بنگال کے اردو لکھنے والوں کا ایک مکمل تذکرہ ہونا چاہئیے تھا مگر یہ کتابچہ محض ایک ڈائرکٹری بن کر رہ گیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں جو اٹھان نظر آتی ہے آگے چل کر کتاب میں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ کتاب کی امتیازی خصوصیت اس میں شامل مختلف ادبا اور شعرا کی تصویریں ہیں۔ اگر مصنف نے کتاب لکھنے میں ذرا محنت سے کام لیا ہوتا تو یہ کتاب اردو کے ذخیرے میں ایک اضافہ شمار ہوتی۔ میں تو توقع کرتا ہوں کہ نظر صاحب کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں زیادہ وسعتِ نظر سے کام لیں گے۔ گراں بازاری کو تسلیم کرتے ہوئے بھی کتاب کی قیمت کافی زیادہ ہے۔ تمام کوتاہیوں کے باوجود اس کتاب کو لائبریریوں میں جگہ دینا محققین کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگا ــــ •

موتی لال ساقی